الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market,New Delhi-110013
Tel. 435 6666, 435 1128
Fax 435 7333, 435 7980
e-mail: info@goodwordbooks.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
434, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137 • Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
5801 SW 106th Ave,
Cooper City, FL 33328 U.S.A.
Tel. (954) 4348404 • Fax (954) 4342551
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ، جنوری، 2002

فہرست

سجدۂ قربت 4

شدت پسندی نہیں 5

بنگلہ دیش کا سفر 6

چشمہ کا سبق 45

معذوری کے باوجود 46

سجدۂ قربت

قرآن کی سورہ نمبر ۹۶ میں ارشاد ہوا ہے: واسجد واقترب (العلق ۱۹) یعنی تم سجدہ کرو اور اللہ کے قریب ہو جاؤ۔ اس آیت کی وضاحت ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أقرب مایکون العبد من ربه و أحبه الیه ما کانت جبهته فی الأرض ساجدا لله (مسلم کتاب الصلاۃ، النسائی کتاب المواقیت، الترمذی کتاب الدعوات، مسند احمد) یعنی بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اور سب سے زیادہ محبوب اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کی پیشانی زمین پر ہو، اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہوئے۔

سجدہ کیا ہے۔ سجدہ آدمی کی داخلی حالت کا ایک خارجی اظہار ہے۔ سجدہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اپنے رب کی عظمت کا شدید احساس طاری ہوا۔ وہ اللہ کے کمال قدرت کے مقابلہ میں اپنے کمال عجز کو سوچ کر تڑپ اٹھا۔ اس کی یہ داخلی کیفیت جسمانی اعتبار سے اس حالت میں ڈھل گئی کہ وہ سجدہ کرتے ہوئے زمین پر گر پڑا جو کہ سرفگندی کی آخری اور انتہائی صورت ہے۔

سجدہ عجز انسانی کی تصویر ہے۔ سجدہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنے آپ کو آخری حد تک اللہ کے آگے ڈال دیا۔ اس نے اپنے پورے وجود کو اللہ کے حوالہ کر دیا۔ اس نے اپنے عجز اور اللہ کی قدرت کا آخری حد تک اعتراف کر لیا۔ جب کوئی انسان اپنے آپ کو ابدیت کے اس درجہ تک پہنچادے تو اس کے بعد بندہ اور خدا کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا۔ اس کے بعد اللہ اس کا ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کا۔

سجدہ کا یہ فائدہ اس کے ظاہر کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ساجد کی داخلی کیفیت کی بنا پر ہے۔ سجدہ کی ظاہری صورت کی حیثیت علامت کی ہے۔ سجدہ ایک بامعنیٰ ربانی عمل ہے۔ حقیقی سجدہ وہ ہے جب کہ آدمی کے جسم کے ساتھ اس کا دل، اس کی روح اور اس کا دماغ بھی اللہ کے آگے گر پڑا ہو۔ سر کو جھکانے کے ساتھ اس نے اپنے پورے وجود کو اللہ کے آگے جھکا دیا ہو۔

شدت پسندی نہیں

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تشددوا علی أنفسکم فیشدد علیکم، فإنَّ قوما شددوا علی أنفسھم فشدَّد اللہ علیھم، فتلک بقایاھم فی الصوامع والدیار (سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب فی الحسد) یعنی تم اپنے آپ پر سختی نہ کرو، ورنہ تمہارے اوپر سختی کی جائے گی۔ کیوں کہ ایک قوم نے اپنے آپ پر سختی کی، پھر اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ تو انھی لوگوں کے باقیات ہیں گرجوں میں اور خانقاہوں میں۔

اس حدیث میں تشدد سے مراد محدود طور پر صرف مذہبی تشدد یا انتہا پسندانہ رہبانیت نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق انسانی زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ جس معاملہ میں بھی اعتدال کا طریقہ چھوڑ کر شدت کا طریقہ اختیار کیا جائے گا وہ سب اس حدیث کے حکم میں شامل ہوگا۔

اعتقادی شدت پسندی یہ ہے کہ جزئی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کی تکفیر اور تفسیق کی جانے لگے۔ اسی طرح عبادتی شدت پسندی یہ ہے کہ فروعی مسالک کی بنیاد پر الگ الگ مسجدیں بنائی جائیں اور اس کو امت میں تفریق کی حد تک پہنچا دیا جائے۔ اسی طرح معاملاتی شدت پسندی یہ ہے کہ رخصت کو کم تر سمجھ کر ہر معاملہ کو عزیمت کا سوال بنا دیا جائے۔

شدت پسند آدمی اپنے آپ میں جیتا ہے۔ وہ صرف اپنی امنگوں کو جانتا ہے۔ اس بنا پر اس کی حیثیت اس انسان جیسی ہو جاتی ہے جو سڑک کو خالی سمجھ کر اس کے اوپر اپنی گاڑی دوڑانے لگے۔ ایسا آدمی کبھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس دنیا میں کامیابی کا راز اعتدال پسندی ہے، نہ کہ شدت پسندی۔ شدت پسندی گویا خدا کے تخلیقی نقشہ کے خلاف جینے کی کوشش کرنا ہے اور اعتدال پسندی خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق اپنی زندگی کی تعمیر کرنا۔

شدت پسندی اپنی ذات کے اعتبار سے تواضع کے خلاف ہے اور دوسروں کے اعتبار سے رعایتِ انسانی کے خلاف۔ اور یہ دونوں چیزیں بلاشبہہ اسلام میں مطلوب نہیں۔

بنگلہ دیش کا سفر

بنگلہ دیش کے دانشوروں کے ایک فورم کی طرف سے ڈھاکہ میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس کی کارروائیاں یکم جون سے ۳ جون ۲۰۰۱ تک جاری رہیں۔ اس کی دعوت پر بنگلہ دیش کا سفر ہوا۔ اس کانفرنس کا عنوان یہ تھا:

South Asian Conference on Fundamentalism and Communalism: Role of Civil Society.

۳۰ مئی ۲۰۰۱ کی شام کو دہلی سے روانگی ہوئی۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر ریاض پنجابی صاحب بھی اس سفر میں ساتھ تھے۔ ان کے ہمراہ دہلی ایرپورٹ پہنچا۔ پروفیسر ریاض پنجابی صاحب کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ انہوں نے 1995 کا ایک سبق آموز واقعہ بتایا۔ انہوں نے بتایا کہ لندن میں سعودی عرب کے سفیر کے پاس کہیں سے ایک پارسل آیا جو دراصل پارسل بم تھا۔ سیکوریٹی والوں نے اس بم کو ناکارہ بنادیا۔ بعد میں سعودی سفیر سے پوچھا گیا کہ اس واقعہ کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ لوگ جن کے پاس دلیل نہیں ہوتی وہ بم کا استعمال کرتے ہیں:

Those who do not have arguments use bombs.

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر مشیر الحسن صاحب بھی ڈھاکہ کی اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ دہلی ائرپورٹ پر ان سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ وہ ہندستانی مسلمانوں کی ۱۹ ویں اور ۲۰ ویں صدی کی تاریخ کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ اس دور کی مسلم شخصیتوں پر انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔

میں نے ان سے گفتگو کے دوران کہا کہ ۱۹ ویں اور ۲۰ ویں صدی میں برصغیر ہند میں جو معروف مسلم شخصیتیں اٹھیں وہ میرے مطالعہ کے مطابق، سب کی سب حال رخی (present oriented) تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی شخصیت مجھے مستقبل رخی (future oriented) دکھائی نہیں دیتی۔ انہوں نے میری اس رائے سے اتفاق کیا۔ پھر انہوں نے کہا کہ بعض افراد مثلاً حکیم اجمل خاں کو

اس سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ میرے لئے ایسا کہنا مشکل ہے۔ کیوں کہ حکیم اجمل خاں اور ان کے ساتھی خلافت تحریک میں سرگرم طور پر شریک ہوئے۔ حالاں کہ جس زمانہ میں یہ لوگ ترکی کی خلافت کے لئے ہندستان میں کام کر رہے تھے اس وقت ترکی کی خلافت عملاً اپنا وجود کھو کر ماضی کا قصہ بن چکی تھی۔

دہلی ائر پورٹ پر جب میں سیکورٹی چک پر پہنچا تو گیٹ پر کھڑے ہوئے پولیس نے ایک مسافر کو روک رکھا تھا۔ کیوں کہ اس کے ہینڈ بیگ میں ٹیگ (tag) لگا ہوا نہیں تھا۔ پولیس والے نے کہا کہ ٹیگ لگا کر لاؤ اس کے بعد اندر جانے کی اجازت ہوگی۔ مسافر نے کہا کہ ٹیگ تو ونڈو پر ملے گا اور ونڈو اب بند ہو چکا ہے۔ مسافر اسی پریشانی کے عالم میں کھڑا ہوا تھا کہ اب میں ٹیگ کہاں سے لاؤں۔ اتفاق سے میرے پاس ایک فاضل ٹیگ موجود تھا وہ میں نے اپنے بیگ سے نکال کر اس کو دیا۔ اس کے بعد پولیس نے مسافر کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔ اس وقت فارسی کی اس مثل کی معنویت سمجھ میں آئی: داشتہ آید بکار (رکھا ہوا کام آتا ہے)

۱۳ مئی کی صبح کو میں دہلی ائر پورٹ پر فجر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں دو نوجوان آکر میرے ساتھ شریک ہو گئے۔ ایک نوجوان کا نام حسن عبد اللہ اور دوسرے کا نام عبد اللہ تھا۔ یہ لوگ انڈونیشیا سے ۴۰ دن کے چلہ پر تبلیغ میں آئے تھے۔ ان سے میں نے کہا کہ آپ کس لئے آئے۔ انہوں نے کہا کہ اپنی اصلاح کے لئے۔ یقین و ایمان حاصل کرنے کے لئے۔ میں نے ان سے مزید تشریحی سوالات کرنے چاہے مگر وہ عربی اور انگریزی دونوں ہی زبانوں سے ناواقف تھے، اس لئے ان سے زیادہ گفتگو نہ ہو سکی۔

۱۳ مئی کی صبح کو ۵ بجے دہلی سے ڈھاکہ کے لئے روانگی ہوئی۔ ۲ گھنٹہ کا یہ سفر بنگلہ ومان کی فلائٹ کے ذریعہ طے ہوا۔ جہاز مقرر وقت سے دو گھنٹہ لیٹ تھا۔ یہ ایک پرانا جہاز تھا جس کی ہر چیز بظاہر معمولی تھی۔ کھانا بھی معمولی دیا گیا۔ بچوں اور عورتوں کا شور جہاز کے اندر سکون کو مسلسل برہم کئے ہوئے تھا۔

البتہ جہاز کی روانگی سے پہلے ٹیپ کی ہوئی آواز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور قرآن کی قرأت سنائی دی۔ یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ یہ ایک مسلم ملک کا جہاز ہے۔

جہاز کے اندر اس کا فلائٹ میگزین Diganto (اپریل۔ جون ۲۰۰۱) دیکھا۔ میگزین کے اندر کوئی قابل مطالعہ مضمون نہیں ملا۔ البتہ اس کے آخری صفحہ پر چند چیزوں کی تصویریں تھیں۔ مثلاً بنگلہ دیش بننے کے بعد چند نیشنل یادگاروں (Monuments) کی تصویریں۔ بنگلہ دیش بننے کے وقت ۱۹۷۱ میں ۳۰ لاکھ سے زیادہ ہلاک ہونے والے بنگلہ دیشیوں کی یادگار، ۱۹۵۲ کے لسانی فسادات میں جو لوگ کام آئے ان کی یادگار، نواب ڈھاکہ کی قیام گاہ احسن منزل، بمان نیشنل کیریئر، وغیرہ کی تصویریں۔ اس کے اوپر یہ لکھا ہوا تھا:

National Symbols that we are proud of.

۳۱ مئی کی صبح کو ڈھاکہ ائر پورٹ پہنچا۔ بنگلہ ومان کی اس فلائٹ میں مجھے ایک چیز قابل تعریف نظر آئی اور وہ اس کی لینڈنگ تھی۔ ڈھاکہ ائر پورٹ پر جہاز اس طرح اتر گیا کہ مجھے اس کا اندازہ بھی نہیں ہوا۔ ائر پورٹ کے لاؤنج میں کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی جو کانفرنس میں شرکت کے لئے آج ہی صبح یہاں پہنچے تھے۔ مثلاً پاکستان کے ائر مارشل اصغر خاں، پروفیسر اے ایچ دانی، مسٹر ایچ کارلیکر، ایم جے اکبر، ڈاکٹر عالیہ امام (پاکستان)، وغیرہ۔

بنگلہ ومان سے دہلی سے ڈھاکہ تک کا سفر زیادہ خوشگوار نہ تھا۔ جہاز بھی پرانا تھا اور سروس بھی معمولی تھی۔ لیکن جب ہم لوگ ائر پورٹ پر پہنچے تو یہاں منظر بالکل دوسرا تھا۔ ڈھاکہ کا ایرپورٹ شاندار نظر آیا۔ ائر پورٹ کے باہر پارک اور سڑکیں بھی دہلی ائر پورٹ سے اچھی تھیں۔

ائر پورٹ سے چل کر ہم لوگ ہوٹل ڈھاکہ شیرٹن (Dhaka Sheraton) پہنچے۔ یہاں میرا قیام روم نمبر ۱۰۱۹ میں تھا۔

۳۱ مئی کی شام کو کانفرنس کے شرکاء ڈھاکہ ساور (Dhaka Savar) لے جائے گئے۔ یہ مقام ڈھاکہ سے تقریباً ۲۵ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں ایک یادگار تعمیر کی گئی ہے

جس کو نیشنل میموریل کہا جاتا ہے۔ یہ بنگلہ دیش کی جنگ آزادی (۱۹۷۱ء) کی یادگار ہے جو پاکستان کے خلاف لڑی گئی تھی۔ یعنی وہ واقعہ جب کہ اقبال اور جناح کی ایک قوم دو مختلف قوم بن کر ایک دوسرے کے خلاف خونیں جنگ میں شریک ہوگئی۔

ہمیں بتایا گیا کہ اس جنگ میں ۳ ملین بنگالی مارے گئے اور ۲۰ ہزار ہندستانی فوجی ہلاک ہوئے۔ اس واقعہ کی یادگار میں یہ میموریل تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ میموریل ایک سو آٹھ ایکڑ رقبہ میں واقع ہے۔ بنگلہ دیش کی اس جنگ آزادی میں ہندستان کو اپنی شمولیت کی یہ قیمت دینی پڑی کہ ملک میں مہنگائی بے پناہ حد تک بڑھ گئی اور مہنگائی میں اضافہ کے علاوہ دوسرے بے شمار مسائل پیدا ہوئے جس کا بظاہر کوئی خاتمہ نظر نہیں آتا۔

یہ نیشنل یادگار بنگلہ دیش کی سب سے اہم جگہ سمجھی جاتی ہے۔ باہر کی بڑی شخصیتیں (dignitaries) جب بنگلہ دیش آتی ہیں تو وہ یہاں آکر اس شہیدی یادگار پر پھول چڑھاتی ہیں۔ یہ میموریل ایک وسیع رقبہ میں نہایت خوبصورت انداز میں بنایا گیا ہے۔ اس کو بنگلہ دیش میں وہی مقام حاصل ہے جو ہندستان میں بننے والی دہلی کی گاندھی سمادھی کو حاصل ہے۔

۳۱ مئی کی شام کو ڈھاکہ کے ہندستانی ہائی کمیشن کی طرف سے کانفرنس کے شرکاء کو رسپشن دیا گیا۔ کانفرنس میں شریک ہونے والے تمام لوگ ہائی کمشنر کی رہائش گاہ آئے اور دیر تک کھانے پینے کے ساتھ ساتھ آپس میں باتیں کرتے رہے۔

ایک بوڑھی خاتون آکر ہمارے پاس بیٹھ گئیں۔ ان کے حلیہ سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوئی مقامی خاتون ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ بنگالی ہیں۔ خاتون نے کسی قدر بلند آواز سے جواب دیا:

Oh, Yes!

ان کے کہنے کے انداز میں فخر کا جذبہ نمایاں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بنگالی خواہ وہ بنگلہ دیشی ہو یا ہندستانی بنگال سے تعلق رکھتا ہو، وہ اپنی زبان اور کلچر کے بارے میں بہت زیادہ نازاں (proud)

ہوتا ہے۔ پاکستان کے لیڈروں نے اس راز کو نہیں سمجھا۔ انہوں نے اردو زبان اور اردو کلچر کو مشرقی پاکستان پر تھوپنا چاہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان اور اردو کلچر تو یہاں رائج نہ ہو سکا البتہ اس کے خلاف یہاں سخت ردعمل ہوا یہاں تک کہ مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔

پاکستان سے آئے ہوئے دو ڈیلی گیٹ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے شیخ مجیب الرحمٰن کی تعریف کی۔ اس کو سن کر دوسرا شخص غصہ میں آ گیا۔ اس نے کہا کہ تم ایک غدار (traitor) کی تعریف کر رہے ہو۔ حالانکہ یہی شخص ہے جس نے پاکستان کو توڑا۔ دوسرے آدمی نے جواب دیا کہ اگر شیخ مجیب الرحمٰن نے ہمارے ملک کو توڑا ہے تو تم نے بھی کسی کے ملک کو توڑا ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے پاکستان کو توڑ کر بنگلہ دیش بنوایا ہے اسی طرح تم نے انڈیا کو توڑ کر پاکستان بنوایا ہے۔ اس پر وہ آدمی مزید غصہ ہو گیا اور یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ تم پاکستان کے دشمنوں کے ایجنٹ معلوم ہوتے ہو۔

یہ انسان کی عجیب وغریب کمزوری ہے کہ ایک ہی فعل وہ خود کرے تو اس کی برائی اس کو دکھائی نہیں دیتی مگر اسی فعل کو جب کوئی دوسرا کرے تو وہ اس کی برائی کو اس طرح دیکھ لیتا ہے جیسے کہ اس کی آنکھ پر دوربین اور خوردبین سے بھی زیادہ طاقتور آلہ لگا ہوا ہے۔

ڈھاکہ کی اس کانفرنس میں مختلف ملکوں کے لوگ آئے تھے۔ پاکستان سے بھی کئی لوگ شریک ہوئے۔ ان میں سے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون پروفیسر ڈاکٹر عالیہ امام تھیں۔ وہ بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہ چکی ہیں۔ وہ اسلام آباد میں رہتی ہیں۔ ان کا ٹیلی فون نمبر یہ ہے: 850564۔

ایک مجلس میں انہوں نے کہا کہ انڈیا میں تو اردو کا جنازہ نکل چکا ہے۔ میں نے کہا کہ انڈیا میں بالفرض اگر اردو کا جنازہ نکلا ہو تو پاکستان میں تو خود اسلام کا جنازہ نکال دیا گیا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ آپ لوگ اکثر ہندستان کو اور ہندستانی مسلمانون کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بہت ناانصافی کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انڈیا کے مسلمان پاکستان کے مسلمانوں

سے کہیں زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ہندستان میں مہاتما گاندھی پر تنقید کرتا ہوں اور وہ وہاں کے انگریزی اخبار میں چھپتی ہے (مثال کے طور پر روزنامہ پانیر، نئی دہلی، ۲۶ جنوری، ۱۹۹۷) آپ لوگ پاکستان کے اخباروں میں قائد اعظم پر تنقید شائع نہیں کر سکتے۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد آج پاکستان کے مسلمانوں سے بہت زیادہ ہے۔

اردو زبان کے تمام بڑے بڑے مسلم رائٹر ہندستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ بشمول پاکستان، پوری مسلم دنیا کا سب سے بڑا دولت مند آدمی ہندستان میں موجود ہے۔ تمام بڑے بڑے اسلامی ادارے ہندستان میں پائے جاتے ہیں۔ مسلم عہد کی تقریباً تمام تاریخی یادگاریں ہندستان میں ہیں، وغیرہ، وغیرہ۔

انہوں نے کہا کہ کوئی زبان ابتدائی اسکولوں کی بنیاد پر زندہ رہتی ہے۔ اور ہندستان میں ابتدائی اسکولوں میں اردو زبان کا خاتمہ کردیا گیا ہے۔ پھر ہندستان میں اردو زبان کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔ میں نے کہا کہ خدا کے فضل سے ہمارے یہاں اسکولوں میں بھی اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر یہ کہ ہندستان میں تقریباً ۵ لاکھ کی تعداد میں چھوٹے بڑے مدرسے پائے جاتے ہیں اور ان سب مدرسوں کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ ہندستان میں اردو زبان کی جڑ کاٹ دی گئی ہے۔

اس سفر میں بہت سے بنگلہ دیشی مسلمانوں سے ملاقات ہوئی۔ کئی لوگ مجھ کو اپنے گھر لے جانا چاہتے تھے۔ مگر کانفرنس کی مصروفیتوں کی وجہ سے میرے پاس زیادہ وقت نہ تھا۔ تاہم ایک بنگلہ دیشی مسلمان کے اصرار پر ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ ۲ جون کی صبح کو وہ اپنی گاڑی لے کر ہوٹل پر آئے اور مجھ کو اپنے گھر لے گئے۔ اس طرح ۲ جون کی صبح کا کچھ وقت ان کے گھر پر گزرا۔ یہ محمد صادق صاحب کا گھر تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ محمد صادق صاحب اردو زبان نہیں جانتے مگر وہ جاپانی زبان روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جاپانی کاروں کے امپورٹر ہیں۔ اس بنا پر انہیں اکثر

جاپان جانا پڑتا ہے۔ اپنے بزنس کے تقاضہ کے تحت انہوں نے جاپانی زبان سیکھ لی۔ پاکستان بنگالیوں کو اردو داں نہ بنا سکا مگر جاپان نے ان کو جاپانی داں بنا دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی میں عملی حقائق کتنی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

ڈھاکہ میں ہماری کتابوں کے بعض ڈسٹری بیوٹر ہیں۔ محمد صادق صاحب کے گھر پر ان کا ذکر ہوا تو ان کے ۱۳ سالہ صاحبزادے نے فوراً کہا کہ مجھ کو ان کا ایڈرس دیجئے میں وہاں سے اسلامی کتابیں لاؤں گا۔ وہ انگلش اسکول میں پڑھتے ہیں۔ اس طرح کے مختلف واقعات سے اندازہ ہوا کہ بنگلہ دیش کے مسلمان اسلام کے ساتھ گہرا جذباتی تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم مورخ کو اس مشکل سوال کا جواب معلوم کرنا ہے کہ سابق مشرقی پاکستان میں اسلامی قیادت کیوں ناکام ہوگئی۔ اور سیکولر قیادت کیوں اتنا کامیاب ہوئی کہ یہ ملک اسلامی پاکستان سے کٹ کر سیکولر بنگلہ دیش بن گیا۔

یکم جون ۲۰۰۱ کی صبح کو میں ڈھاکہ شیریٹن کے ڈائننگ ہال میں ناشتہ کر رہا تھا۔ میرے قریب کی میز پر ایک اور صاحب بیٹھے ہوئے تھے جو غالباً انڈونیشیا سے آئے تھے۔ اتنے میں ایک اور صاحب اپنا خوبصورت بیگ لئے ہوئے داخل ہوئے۔ انہوں نے مذکورہ انڈونیشی سے کہا کہ تکلیف کے لئے معافی (sorry to disturb you)۔ اور پھر وہ ان کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ناشتہ کی میز پر دونوں کے درمیان انگریزی میں گفتگو ہونے لگی۔ آنے والے شخص کے لفظ لفظ سے حوصلہ اور اعتماد کا اظہار ہو رہا تھا۔ ناشتہ مکمل کر کے دونوں پر اعتماد انداز میں اٹھے اور اپنے خوب صورت بیگ ہاتھ میں لئے ہوئے باہر چلے گئے۔

میں نے سوچا کہ اس زمانہ میں جو شخص یہ صلاحیت رکھتا ہو کہ وہ انگریزی زبان میں بخوبی اظہار خیال کر سکے، اس کو یہ موقع حاصل ہے کہ وہ جہاں بھی جائے وہ فوری طور پر دنیا کی کلچرل مین اسٹریم میں شامل ہو سکے۔ قدیم فارسی شاعر نے اپنے زمانہ میں جو بات منعم کے لئے کہی تھی وہ آج زیادہ بہتر طور پر انگریزی داں کے لئے صحیح ثابت ہوتی ہے:

منعم بہ کوہ و دشت و بیاباں غریب نیست   ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

میری تقریر یکم جون کو دو پہر بعد کے اجلاس میں ہوئی۔ میری تقریر کے بعد ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے مخالفین کا جواب تشدد کے بجائے پر امن ذرائع سے دیا جائے۔ ہم نے اس کی کوشش کی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ایسی حالت میں ہم کو آپ اس مسئلہ کا کیا حل بتاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس کا حل بہت آسان ہے اور وہ مشہور انگریزی مقولہ کے مطابق یہ ہے کہ اپنی کوشش جاری رکھیے:

Try, try, try again.

میری تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ فنڈ منٹلزم دراصل انتہا پسندی (extremism) کا دوسرا نام ہے جو بڑھ کر فناٹسزم (fanaticism) کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کے لئے غلو اور تشدد کے الفاظ آئے ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: **لا تغلوا فی دینکم** (النساء ۱۷۱) یعنی تم لوگ اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ: **ایاکم والغلو فی الدین فانما ھلک من کان قبلکم بالغلو فی الدین** (احمد، ابن ماجہ، النسائی) یعنی تم لوگ دین میں غلو کرنے سے بہت زیادہ بچو، کیوں کہ پچھلی امتیں اس لئے ہلاک ہوگئیں کہ انھوں نے دین میں غلو کیا۔ اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لاتشددوا علی انفسکم فیشدد علیکم** (ابوداؤد)

میں نے کہا کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ اس کی بنیاد اعتدال پسندی، رواداری، خیر خواہی اور انسانی رعایت پر قائم ہے۔ فنڈ منٹلزم اسلام کے پورے ڈھانچہ کو تباہ کر دینے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فنڈ منٹلسٹ نقطۂ نظر کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ میری یہ تقریر اگلے صفحات میں نقل کی جارہی ہے۔

یکم جون کی شام کو ۸ بجے بنگلہ دیش کی خاتون پرائم منسٹر شیخ حسینہ کی سرکاری رہائش گاہ پر ان سے ملاقات ہوئی۔ کانفرنس کے تمام شرکاء ایک بڑے ہال میں لے جائے گئے اور سب سے اجتماعی ملاقات ہوئی۔ یہ بہت بڑی رہائش گاہ تھی۔ اس کے اندر دور تک کار کے ذریعہ چلتا رہا۔

ایک صاحب نے خاتون وزیر اعظم کے بارے میں کہا:

She has good reputation of punctuality.

جب وہ ہال میں داخل ہوئیں تو انہوں نے السلام علیکم کہا۔ وہ بات بات میں مسکراتی تھیں۔ ایک موقع پر انہوں نے کہا:

My people are religious indeed. There is no doubt about it, but they are not fanatics.

شیخ حسینہ کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ ایک ذہین خاتون ہیں۔ مثلاً انہوں نے بتایا کہ جب میں ایک سرکاری دورہ پر دلی گئی تو اس وقت انڈیا اور پاکستان کے درمیان سخت تناؤ کا ماحول تھا۔ اتفاق سے جس دن شیخ حسینہ دلی پہنچیں اس دن یہاں تیز بارش ہو رہی تھی۔ کسی اخبار نویس نے پوچھا کہ انڈیا اور پاکستان کے درمیان جو تناؤ چل رہا ہے اس میں آپ کا رول کیا ہے۔ انہوں نے بارش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں یہاں بارش کے ساتھ آئی ہوں تاکہ تناؤ کی فضا کو کم کروں:

I have come here with rains to cool down tempers.

شیخ حسینہ بنگلہ دیش کے بانی شیخ مجیب الرحمٰن کی صاحب زادی ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، بنگلہ دیش بننے کے بعد ۱۹۷۵ میں شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے گھر والوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ شیخ حسینہ صرف اس لیے قتل ہونے سے بچ گئیں کہ اس وقت وہ بنگلہ دیش سے باہر تھیں۔ چنانچہ شیخ حسینہ اپنے آپ کو بنگلہ دیش میں غیر محفوظ تصور کرتی ہیں۔ اس مسئلہ کا حل انہوں نے یہ نکالا ہے کہ انہوں نے بنگلہ دیش اسمبلی سے ایک ایسا قانون پاس کروایا ہے جس کے مطابق انہیں اپنے سیاسی عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ساری عمر خصوصی سیکورٹی حاصل رہے۔ میرے نزدیک یہ تحفظ سراسر ناکافی ہے۔ ان کے لیے اصل تحفظ کی بات یہ تھی کہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے قاتلوں کو معاف کر دیں تاکہ ان کا جذبۂ انتقام ٹھنڈا ہو جائے۔ مگر انہوں نے حکومت میں آنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے قاتلوں کے خلاف سرکاری اور عدالتی کارروائی شروع

کردی۔ ان کی یہی انتقامی پالیسی ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس دنیا میں انتقام کو بھلانا پڑتا ہے۔ اگر آپ انتقام لیں تو آپ کو جاننا چاہئے کہ انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا اور پھر یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

ایک صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم کو چاہئے کہ مذہبی فنڈمنٹلزم کا مقابلہ سیکولر دلائل سے کریں۔ ان کا خیال تھا کہ مذہبی دلائل سے مقابلہ کرنے کی صورت میں وہ زیادہ زور پکڑ جائیں گے۔ میں نے کہا کہ آپ نے یہ بڑی عجیب بات کہی۔ ایسا طریقہ کبھی موثر نہیں ہوسکتا۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ لوگ جن کو آپ اسلامک فنڈمنٹلسٹ کہتے ہیں وہ اسلامی دلائل کی بنیاد پر کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے ذہن کو بدلنے کے لئے وہی دلائل درکار ہیں جن کو وہ اہمیت دیتے ہیں۔ یعنی اسلامی دلائل۔ کوئی اور دلائل خواہ وہ کتنے ہی زیادہ ہوں، ایسے لوگوں کو متاثر نہیں کرسکتے۔ ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ تھوڑے سے استثناء کو چھوڑ کر پوری امت کا ذہن سیاسی ہوگیا ہے۔ سیاسی طرز فکر کے سوا کوئی اور طرز فکر لوگوں کو معلوم ہی نہیں۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بڑی بڑی تحریکیں سراسر بے نتیجہ ثابت ہورہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاست زندگی کے سفر کا اختتام ہے، وہ زندگی کے سفر کا آغاز نہیں۔ مسٹر حمزہ علوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ پاکستانی تحریک کوئی اسلامی تحریک نہ تھی:

Pakistan movement was not an Islamic movement.

یہ ایک تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی تحریک تھی۔ یہ مکمل طور پر ایک سیکولر تحریک تھی۔

مسٹر محمد علی جناح نے ۱۹۴۸ میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں سیکولر ڈیماکریسی کا اعلان کیا مگر بعد کو وہاں اسلام کا نعرہ لگنا شروع ہوگیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ اسلامی لوگ ابتداءً پاکستان تحریک کے مخالف تھے۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو وہ انا کنا معکم (العنکبوت ۱۰) کا نعرہ لگاتے ہوئے اس کے قائد بننے کی کوشش کرنے لگے، اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکے۔

بنگلہ دیش کی تقریباً دس کروڑ کی آبادی میں ۸۰ فیصد سے زیادہ مسلمان ہیں۔ یہاں اسلام

۱۳ ویں صدی میں پھیلا جب کہ اس علاقہ میں مسلم نواب کی حکومت تھی۔ اس بنا پر کچھ کٹر قسم کے لوگوں نے لکھا ہے کہ یہاں کے ہندو جبر کے ذریعہ مسلمان بنائے گئے۔ ایک بنگالی ہندو سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔

سوامی وویکا نند جو خود بھی ایک بنگالی ہندو تھے انہوں نے سختی کے ساتھ اس کی تردید کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ہندو سماج میں اونچ نیچ کا جو مسئلہ تھا اور ہندو زمیندار جس طرح کسانوں کا استحصال کرر ہے تھے، وہ یہاں کے ہندوؤں کے لیے اسلام میں داخلے کا سبب بنا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ کہنا لغو ہے کہ بنگال کے ہندوؤں نے جبری طور پر اسلام قبول کیا:

It is nonsense to say that the Hindus (of Bengal) were converted to Islam by force.

بنگلہ دیش ۱۹۷۱ کے بعد بنا۔ اس کے بعد اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن کے ٹائٹل اس قسم کے تھے، مثلاً: 'Dismemberment of Pakistan' اور 'Partition after partition'

ایک ٹائٹل یہ تھا: پاکستان کٹ ٹو سائز 'Pakistan cut to size' ۔ یہ ٹائٹل بہت بامعنٰی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بنگلہ دیش بننے سے پہلے پاکستان کا بظاہر جو بڑا سائز تھا وہ ایک مصنوعی سائز تھا۔ وہ گھٹ کر اپنے اصلی سائز پر آ گیا۔

یہی حال ہر انسان کا ہے۔ ہر انسان اپنی بڑائی کے فرضی احساس میں جیتا ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ کو اپنی حقیقی حیثیت سے زیادہ سمجھے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ صرف اللہ عزوجل پر ایمان ہے جو آدمی کے مصنوعی برتری کے احساس کو ختم کرسکتا ہے۔ مومن باللہ کی صحیح تعریف میرے نزدیک یہ ہے کہ اللہ کی برتری کے احساس نے اس کو انسانِ اصلی (man cut to size) بنا دیا ہو۔ یہاں کے مسلمانوں سے ملاقات کے دوران یہ اندازہ ہوا کہ بنگلہ دیش کے عوام کا کلچر مکمل طور پر پاکستان کے کلچر سے مختلف تھا۔ مثال کے طور پر بنگلہ دیش کے مسلمان بنگالی زبان بولتے ہیں اور پاکستانی اردو زبان بولتے ہیں۔ بنگلہ دیش کے مسلمان ٹیگور کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں اور پاکستان کے لوگ اقبال

کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں۔ بنگلہ دیش کی عورتیں بندی لگاتی ہیں اور پاکستان کی عورتیں اس کو ہندو علامت سمجھتی ہیں۔ تقریباً ہر اعتبار سے دونوں کا کلچر الگ الگ تھا۔ ایسی حالت میں پاکستان اور بنگلہ دیش کو ملا کر ایک ملک بنانا عام حالت میں بھی سخت مشکل تھا اور دونوں کے درمیان ہزار میل کی دوری کی بنا پر وہ سرے سے ممکن ہی نہ تھا۔ اس قسم کے سیاسی عجوبہ کا تصور صرف کسی شاعر کے دماغ میں آسکتا تھا یا کسی انتہائی جذباتی لیڈر کے دماغ میں۔

بنگلہ دیش کے جن لوگوں سے میری ملاقات ہوئی وہ تقریباً متفقہ طور پر یہ کہتے ہوئے ملے کہ ۱۹۷۱ کی جنگ میں پاکستان نے ہمارے اوپر بدترین ظلم کیا۔ ۳ ملین بنگالی مار ڈالے گئے۔ ۲۰ ہزار ہندستانی فوجی ہلاک ہوگئے۔ معاشی نظام تباہ ہوگیا، وغیرہ۔ مگر پاکستان کے لوگوں سے بات کیجئے تو وہ اس سے مختلف تصویر پیش کریں گے۔ وہ پاکستان کے کسی ظلم کا ذکر نہیں کریں گے۔ اس کے بجائے وہ یہ بتائیں گے کہ بنگلہ دیش کے مسلمانوں نے پاکستان کے خلاف کیا کیا مخالفانہ کارروائیاں کیں اور کس طرح پاکستان کو نقصان پہنچایا۔

انسان کا یہ عام مزاج ہے کہ جب ایک گروہ کا دوسرے گروہ سے اختلاف ہو جائے تو دونوں ایک دوسرے کی صرف برائیاں بیان کرتے ہیں، وہ ان کی اچھائیوں کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ برائیاں بھی یا تو فرضی ہوتی ہیں یا مبالغہ آمیز۔ اس بنا پر دونوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ ہر ایک دونوں کی برائیوں سے آخری حد تک باخبر ہوتا ہے اور ہر ایک دونوں کی اچھائیوں سے آخری حد تک بے خبر۔

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ماضی کے دور میں یہود میں سے کچھ لوگوں کو خنزیر بنا دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے جسم کو انسانی جسم کے بجائے خنزیر کا جسم بنا دیا گیا۔ اس سے مراد دراصل صفات ہیں۔ یعنی کردار کا بگڑ جانا۔ صاف ستھری غذا کے بجائے گندی غذا ان کو موافق آنے لگے۔ مخلصانہ کردار کے بجائے منافقانہ کردار ان کو زیادہ محبوب ہو جائے۔ بااصول زندگی کے بجائے مفاد پرستانہ زندگی ان کو زیادہ راس آنے

لگے۔ انسانی خیر خواہی کے بجائے انسانی عداوت ان کا نفسیاتی مزاج بن جائے۔

بنگلہ دیش کے لوگ پر فخر طور پر آزاد بنگلہ دیش کا لفظ بولتے ہیں۔ ۱۹۷۱ میں پاکستان سے الگ ہونے کے لئے جو جنگ لڑی گئی اس کو یہاں کے لوگ آزادی کی عظیم جنگ (Glorious war of independence) کہتے ہیں۔ اس باہمی جنگ میں دونوں طرف کے تقریباً ۵ ملین مسلمان ہلاک ہوگئے۔

پاکستان کے لیڈروں نے ہندوؤں سے آزادی کی جنگ لڑ کر پاکستان بنوایا۔ اور جب پاکستان بن چکا تو خود پاکستانی مسلمان، اس کے دونوں حصوں میں باہمی اقتدار کی جنگ لڑنے میں مشغول ہوگئے۔ موجودہ زمانہ کے اسلام پسند مسلمان ہر جگہ اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے جہاد چھیڑے ہوئے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ 'حبک الشی یعمی و یصم' کا مصداق بن چکے ہیں۔ مذکورہ قسم کے واقعہ سے انہوں نے یہ سبق نہیں لیا کہ سیاسی تحریک، خواہ وہ اسلام کے نام پر چلائی جائے اس کا انجام ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے وہ اغیار سے آزادی کے نام پر لڑی جاتی ہے اور جب یہ پہلا مرحلہ ختم ہوتا ہے تو وہ اقتدار کے لئے باہمی جنگ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

اسلامک آرگنائزیشن (OIC) کی طرف سے ڈھاکہ میں ایک اسلامی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ یہاں اسلام کو بطور تاریخ نہیں بلکہ بطور دینیات (تھیالوجی) پڑھایا جاتا تھا۔ مگر جلد ہی یہ یونیورسٹی پولیٹکل اسلام کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ اس کے بعد جنرل ضیاء الرحمٰن کے زمانہ میں یہاں کے سیکولر طبقہ نے اس کو ڈھاکہ سے ہٹا کر دو سو کیلومیٹر دور کشتیا میں منتقل کرادیا۔ اس کے بعد یہاں کے اسلام پسند لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ سیکولر مسلمان اسلام دشمن ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس میں زیادہ غلطی یہاں کے اسلام پسند طبقہ کی ہے۔ یہ لوگ اپنے کو اسلام پسند کہتے ہیں مگر حقیقت میں وہ سیاست پسند لوگ ہیں۔ وہ اسلام کے نام پر اپنی سیاست چلاتے ہیں۔ اپنے اسی سیاسی مزاج کی بنا پر یہ لوگ ہر مسلم ملک میں سیاسی اپوزیشن کا کردار ادا کررہے ہیں اور ہر مسلم ملک مین صرف مسائل پیدا کررہے ہیں۔ دوسری طرف سیکولر طبقہ یہ سمجھنے

لگا ہے کہ اسلام ہر ترقی کا مخالف ہے۔ مگر سیکولر طبقہ حقیقۃً کچھ مسلمانوں کی تعبیر دین کا مخالف ہے، وہ خود اسلام کا مخالف نہیں۔

سیاسی اپوزیشن کا طریقہ کوئی مثبت نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔ وہ صرف منفی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کی تاریخ کے آغاز ہی میں حالات نے اس معاملہ کی ایک انتہائی مثال قائم کر دی تھی۔ یہ امام حسین کی مثال تھی۔ امام حسین کا واقعہ گویا اس بات کی ایک انتہائی مثال ہے کہ قائم شدہ حکومت کے خلاف اپوزیشن کی سیاست ملّت کے لئے کیا معنیٰ رکھتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسلمان لیڈروں نے کبھی اس مثال سے سبق نہیں لیا۔ موجودہ زمانہ کے سیاست پسند مسلمانوں نے تو حسین کی مثال ہی کو اعلیٰ نمونہ قرار دے کر اس کی تقلید میں ساری دنیا میں سیاسی ہنگامہ آرائی کو تحریک اسلامی اور دعوت اسلامی کا نام دے دیا ہے۔

ڈھاکہ اور اسی طرح کی دوسری بڑی بڑی کانفرنسوں میں شرکت کے بعد میرا مشترک تاثر یہ ہے کہ تقریباً ہر وہ کانفرنس جس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو بلایا جاتا ہے وہ زیادہ تر ایک ہی نوعیت کی ہوتی ہے۔

یہ لوگ اس طرح بولتے ہیں جیسے کہ وہ بس اپنی انگریزی دانی کا مظاہرہ کرنے کے لئے آئے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مقرر اپنی تقریر میں کوئی واضح اور متعین پیغام دے سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد اپنی انگریزی دانی کا مظاہرہ کرنا ہے، نہ کہ کوئی متعین بات کہنا۔

پاکستان سے چودہ آدمیوں کا وفد اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ ایک صاحب سے میں نے کہا کہ انڈیا اور پاکستان میں نیوکلیر ہتھیاروں کی ریس چل رہی ہے۔ کیا آپ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ایٹم بم بنایا تو جاسکتا ہے مگر وہ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

جاپان اس کے استعمال کا اول و آخر میدان تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے یہاں تو یہ حالت ہے کہ میاں نواز شریف کی حکومت کے زمانہ میں ہمارے پاکستانی اخباروں میں ایسے ایڈیٹوریل شائع ہوئے جن کا عنوان یہ تھا —— میاں صاحب بٹن دبادیں، اللہ خیر کرے گا۔

میں نے کہا کہ یہ تو دیوانگی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں تھے تو کچھ صحابی نے کہا کہ مشرکین کے خلاف ہم کو قتال کی اجازت دیجئے، تو آپ نے فرمایا کہ اصبروا فانی لم أومر بالقتال۔ میں نے کہا کہ جو لوگ یہ نہ جانیں کہ ایٹم بم ایک بوم رینگ کھیل ہے ان کو چاہئے کہ وہ چپ رہیں، نہ کہ اس قسم کا بے معنیٰ کلام کریں۔

۲ جون کی دوپہر کو بنگلا دیش کے مشہور اسلام پسند لیڈر پروفیسر غلام اعظم سے ان کے مکان پر ملاقات ہوئی۔ پروفیسر غلام اعظم (پیدائش ۱۹۲۲) نے پولیٹکل سائنس میں ایم اے کیا ہے۔ وہ طالب علمی کے زمانہ سے سیاست میں شریک ہو گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ۱۹۴۶ میں جب انڈیا میں الیکشن ہوا اور کانگریس اور مسلم لیگ کا مقابلہ ہوا تو پاکستان کے نام پر ووٹ دینے والے مسلمان سب سے زیادہ موجودہ بنگلہ دیش میں تھے۔ اس کے بعد موجودہ انڈیا میں، اور سب سے کم موجودہ پاکستان میں۔

میں نے کہا کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ بعد کو تینوں حصوں کے مسلمانوں کا حال کچھ اور ہو گیا۔ بنگلہ دیش کی قوم پرست لیڈرشپ کے تحت اس ملک نے سیکولرزم کو اختیار کر لیا حتی کہ اس کا اسلامی دستور بدل دیا گیا۔ اسی طرح انڈیا کے مسلمان آج سیکولر دستور کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں بھی اکثریت سیکولر مسلمانوں کی ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد پاکستان کی اسلام پسند پارٹیوں نے چھ بار الیکشن میں حصہ لیا اور ہر بار وہ لوگ سیکولر پارٹیوں کے مقابلہ میں ہار گئے۔ ان اسلام پسندوں کو پاکستان کا تین فیصد سے زیادہ ووٹ نہ مل سکا۔

پروفیسر غلام اعظم خاں بنگلہ دیش کی مشہور شخصیت ہیں۔ وہ یہاں کی اسلامی تحریک کے سب سے بڑے لیڈر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ وہ ڈھاکہ میں رہتے ہیں۔ ۲ جون کی صبح کو ان کی رہائش گاہ پر ان سے گفتگو ہوئی۔ وہ بہت خوش ہوئے اور اپنی زندگی کے بہت سے تجربات بتائے۔

پروفیسر غلام اعظم صاحب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بہت قریب رہے ہیں۔ ان سے

میں نے پوچھا کہ مولانا مودودی کی کوئی خاص صفت بتائیے۔ انہوں نے ایک بات یہ بتائی کہ مولانا مودودی ہمیشہ مجلس شوریٰ میں یہ کوشش کرتے تھے کہ مجلس شوریٰ میں ہر بات اتفاق رائے کے ساتھ طے کی جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ان امتی لا تجتمع علی ضلالة (ابن ماجہ، الفتن) یعنی میری امت کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ مجلس شوریٰ میں اتفاق رائے سے کسی بات کا طے ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ حق ہے۔

میں نے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے مگر اس کی یہ تشریح بالکل غلط ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ کسی جماعت کے افراد کسی بات پر اتفاق رائے کر لیں تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ یہ بات حق ہے۔ اس کے بجائے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ امت محمدی پر ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا جب کہ امت کے سارے افراد گمراہی پر متحد ہو جائیں اور کوئی شخص حق کا اعلان کرنے والا باقی نہ رہے۔

پروفیسر غلام اعظم صاحب نے کہا کہ میں تھنکر مودودی کے مقابلہ میں آرگنائزر مودودی کو زیادہ بڑا سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں واقعات کی گواہی آپ کی تائید نہیں کرتی۔ میں نے کہا کہ اس پہلو سے مولانا مودودی کی سب سے بڑی ناکامی یہ ہے کہ ان کے تمام بڑے بڑے رفقاء نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مثلاً مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا منظور نعمانی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن، مولانا عبدالرحیم اشرف، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا سلطان احمد، مولانا کوثر نیازی، وغیرہ۔ پھر کیسے آپ یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک کامیاب آرگنائزر تھے۔ میں نے کہا کہ کامیاب آرگنائزر وہ ہے جو اپنے رفقاء کو اختلاف کے باوجود اپنے ساتھ متحد رکھ سکے۔ جیسا کہ ہندستان میں گاندھی نے کیا۔ پروفیسر غلام اعظم صاحب میرے اس سوال کا کوئی واضح جواب نہ دے سکے۔

۲ جون کو جب کہ میں ڈھاکہ میں تھا، نیپال سے اندوہناک قتل کی خبر آئی۔ شاہ نیپال کے بیشتر خاندان کو اچانک محل کے اندر قتل کر دیا گیا۔ ڈھاکہ کے انگریزی اخبار

The Independent کی دوسطری سرخی یہ تھی:

Palace massacre in Nepal, Crown Prince kills King Birendra, Queen Aishwarya, 11 family members.

اس حادثہ میں شاہ بریندرا اور کوین ایشوریہ سمیت ۱۳ آدمی کو اچانک گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

یہ حادثہ غالباً گدی کے جھگڑے کے نتیجہ میں پیش آیا۔ جب سے دنیا میں بادشاہت قائم ہے ہمیشہ گدی کے نام پر قتل وتشدد کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ سیاسی قتل کے اس سلسلہ کو صرف جدید جمہوریت نے ختم کیا۔ جمہوری نظام نے اس کو ممکن بنایا کہ سیاسی گدی الیکشن کے ذریعہ ایک سے دوسرے کو منتقل ہو جائے، جب کہ اس سے پہلے وہ صرف موت یا قتل کے ذریعہ ہی منتقل ہو سکتی تھی۔ مثال کے طور پر اورنگ زیب مغل گدی پر قبضہ کرنا چاہتا تھا مگر اس سیاسی تبدیلی کے لیے اس کے پاس کوئی پرامن طریقہ نہ تھا، چنانچہ اس نے تلوار کی طاقت کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل کیا۔

ڈھاکہ ائرپورٹ پر ایک ہفتہ وار نیوز لیٹر (Holiday Aviator) پڑھنے کو ملا۔ یہ ۲۵ مئی ۲۰۰۱ کا شمارہ تھا۔ اس کی ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ دبئی اور حیدرآباد کے درمیان إمارات (Emirates) کی طرف سے ایک براہ راست نئی ہوائی سروس شروع کی گئی ہے۔ یہ سروس حیدرآباد اور دبئی کے درمیان نان اسٹاپ سروس ہوگی اور وہ ہفتہ میں تین بار مسافروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے گی۔ میں نے اس خبر کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ جس نوابی دور کے خاتمہ پر مسلمان عرصہ تک فریاد کرتے رہے اس دور میں صرف سالانہ بحری سفر ممکن تھا اور وہ بھی حج کی عبادت کے لئے۔ اب اسی حیدرآباد میں ہفتہ میں تین بار عالمی اقتصادی سفر ممکن ہو گیا ہے۔

یہ اہل حیدرآباد کے لئے ایک عظیم نعمت ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں ان کے شکایتی مزاج کی بنا پر شکر کا جذبہ مکمل طور پر ختم ہو گیا ہے۔ چنانچہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کو جدید تبدیلیوں کی خبر ہی نہیں۔ اور ان مفید تبدیلیوں پر سینہ میں شکر کا چشمہ جاری ہونا تو اتنا نایاب ہے کہ آج شاید کوئی بھی مسلمان نہیں جو اس عظیم روحانی کیفیت کا تجربہ کرے۔

۲ جون کی شام کو الحاج سید ابو الحسین صاحب (ممبر بنگلہ دیش پارلیمنٹ) نے کانفرنس کے تمام شرکاء کو ڈنر دیا۔ اس موقع پر ہر ایک کو ڈھاکہ کی جامدانی ساڑی بطور تحفہ پیش کی گئی۔ اس موقع پر لمبا کلچرل پروگرام ہوا۔ اس میں بنگلہ دیشی خواتین نے حصہ لیا جس میں زیادہ تر مسلم خواتین تھیں۔ مجھے کلچرل پروگرام سے کوئی دلچسپی نہیں تاہم اس کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ بنگلہ دیش کے مسلمانوں کا کلچر بڑی حد تک وہی ہے جو مغربی بنگال کے ہندوؤں کا کلچر ہے۔ اس موقع پر رابندر ناتھ ٹیگور کے کئی گانے سنائے گئے، جب کہ پاکستان کے اقبال کا کسی نے نام نہیں لیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان اور مشرقی پاکستان میں کلچر کا کتنا زیادہ فرق ہے۔

بنگلہ دیش میں تبلیغی جماعت کا کافی کام ہو رہا ہے۔ تبلیغ کے ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ تبلیغی جماعت ایک اچھا کام کر رہی ہے مگر یہی کافی نہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۱ میں جب پاکستانی اور بنگلہ دیشی مسلمانوں کے درمیان مارکاٹ شروع ہوئی تو تبلیغ کے لوگ بھی اس میں شریک تھے۔ حالانکہ اس قسم کا باہمی قتل بیک وقت حرام بھی ہے اور نتیجہ کے اعتبار سے غیر مفید بھی۔ مگر تبلیغی جماعت کے افراد کو چونکہ صرف فضائل اور کہانیوں کی بنیاد پر کھڑا کیا گیا تھا، ان کے اندر کوئی وسیع تر سوچ پیدا نہیں کی گئی تھی اس لئے وہ اس معاملہ کو اسلامی نقطۂ نظر سے سمجھ نہ سکے اور عام سیاسی رو کا شکار ہو گئے۔

میں نے کہا کہ فضائل کی داستانوں کی بنیاد پر کسی قوم کو اٹھانا روٹین کے حالات میں مفید ہو سکتا ہے۔ مگر زندگی میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ غیر معمولی واقعات پیش آتے ہیں۔ اس لئے لوگوں کے اندر یہ سوچ بھی ہونی چاہئے کہ وہ ان غیر متوقع حالات (eventualities) کا سامنا کرنے کے لئے بھی فکری طور پر تیار رہیں۔ یہی حادثہ ان دوسری تحریکوں کے ساتھ بھی پیش آیا جو جذباتیت یا خوش اعتقادی کی بنیاد پر اٹھائی گئیں۔ ان کے سامنے بھی جب غیر متوقع حالات پیش آئے تو وہ فکری اعتبار سے تیار نہ ہونے کی بنا پر حالات کا شکار ہو کر رہ گئیں۔

مشرقی بنگال (موجودہ بنگلہ دیش) کا علاقہ وہ علاقہ ہے جہاں صدیوں سے صوفیاء کا کام

ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۷۱ تک یہ کہا جاتا تھا کہ تبلیغی جماعت کا سب سے بڑا عالمی اجتماع بنگلہ دیش میں ہوتا ہے۔ اور جب وہاں اجتماعی دعا ہوتی ہے تو اس میں شرکت کے لئے اتنے زیادہ آدمی آتے ہیں کہ شہر خالی ہو جاتا ہے۔ مگر اسی بنگلہ دیش میں ۱۹۷۱ میں مسلمانوں کی باہمی جنگ اتنے بڑے پیمانہ پر ہوئی کہ شاید پوری مسلم تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں۔

کچھ لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مسلمانوں کا باہم ایک دوسرے کا قتل کرنا اسلام میں سراسر حرام ہے۔ اس کو قرآن میں جہنمی فعل کہا گیا ہے۔ پھر طویل دینی سرگرمیوں کے باوجود اس سرزمین میں اتنا بڑا غیر اسلامی واقعہ کیوں ہوا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ صوفیاء کی تحریک اور تبلیغی تحریک دونوں ہی برکت اور فضائل اور مقدس کہانیوں کی بنیاد پر چلائی گئیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی دینی بیداری اور شعوری انقلاب کی بنیاد پر نہیں چلائی گئی۔ چنانچہ لاکھوں لوگ برکت اور فضائل کے تصور کے تحت بظاہر دیندار تو بن گئے مگر ان کی حقیقی سوچ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر اس دینی سرزمین میں ۱۹۷۱ کا المیہ پیش آیا۔ اصل یہ ہے کہ کوئی حقیقی اسلامی تحریک فکری انقلاب کی بنیاد پر چلتی ہے، نہ کہ برکت اور فضیلت کی بنیاد پر۔

۱۹۷۱ میں پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان جو خونی جنگ ہوئی اور جس کے بعد مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بنا اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بنگلہ دیش میں چھپنے والی کتابوں کو پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ اس خونی واقعہ کا سبب پاکستان کا ظلم تھا۔ اس کے برعکس پاکستان میں چھپنے والی کتابیں بتاتی ہیں کہ اس کے پیچھے بنگلہ دیش کے ہندو تھے۔ ان ہندوؤں نے سازش کے ذریعہ بنگلہ دیش کو پاکستان سے الگ کروایا۔

میں نے کچھ لوگوں سے کہا کہ یہ دونوں ہی توجیہیں سطحی ہیں۔ اس معاملہ کا اصل ذمہ دار اگر کوئی ہے تو وہ دونوں ملکوں کے مسلم لیڈر رہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے جب پاکستان کی تحریک چل رہی تھی تو بنگلہ دیش کے لیڈروں بشمول شیخ مجیب الرحمٰن نے اس تحریک میں نہایت جوش کے ساتھ

حصہ لیا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ بنگالی لیڈر اگر مستقبل سے اتنا زیادہ بے خبر تھے تو ان کے لئے سیاست میں حصہ لینا ہی جائز نہ تھا کیوں کہ لیڈر صرف اس شخص کو بننا چاہئے جس کے اندر مستقبل بینی کی صفت ہو۔

یہی معاملہ پاکستان کا ہے۔ اس تحریک کے مفکر اعظم اور قائد اعظم کے بیانات کے مطابق، غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کو ہندوؤں سے خطرہ تھا۔ اس لئے انہوں نے پاکستان بنوایا تاکہ مسلمان اپنے لئے ایک محفوظ علاقہ حاصل کرلیں۔ اب اگر پاکستان بننے کے باوجود ہندوؤں کا خطرہ مزید اضافہ کے ساتھ باقی ہے تو ہندوؤں کو الزام دینے سے پہلے مفکر اعظم اور قائد اعظم کی فکری نا اہلی کا اعتراف کیا جائے۔ اور یہ مانا جائے کہ یہ لوگ خواہ، جس صلاحیت کے بھی مالک ہوں، مگر وہ بصیرت (vision) سے یقینی طور پر خالی تھے۔ ایسی حالت میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کسی اردو شاعر کے اس مصرعہ کو دہرایا جائے کہ:

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

بنگلہ دیش کے ایک اسلام پسند لیڈر حج کرنے گئے۔ وہاں انہوں نے اخبار عرب نیوز کو انٹرویو دیا جو اس کے ۱۳ مارچ ۲۰۰۱ کے شمارہ میں اس عنوان کے تحت چھپا ہے:

بنگلہ دیش کی حسینہ حکومت اسلام دشمنی پر تلی ہوئی ہے

اس انٹرویو کے چند جملے یہ تھے ــــــ یہ حکومت بنگلہ دیش سے اسلام اور مسلمانوں کے نام ونشان کو مٹانے پر تلی ہوئی ہے۔ درحقیقت بنگلہ دیش میں فی الوقت اسلام خطرہ میں ہے۔ ہم تہیہ کئے ہوئے ہیں کہ ہم اپنے جہاد کو اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک کہ ہمیں شہادت یا قیادت نصیب نہ ہو جائے۔

اس قسم کی باتوں کا تعلق اسلام سے نہیں ہے بلکہ لیڈری سے ہے۔ اس لئے کہ کوئی بھی شخص بنگلہ دیش جاکر دیکھ سکتا ہے کہ اسلام کو مٹانے کی بات لغویت کی حد تک بے بنیاد ہے۔ اور جہاں تک شہادت اور قیادت کی بات کے غیر اسلامی ہونے کا سوال ہے تو اس کو غلط ثابت کرنے کے

FUNDAMENTALISM AND ISLAM

I would like to say a few words about fundamentalism and Islam. I have studied Islam from its original sources—the Quran and *Hadith*. I can say with confidence that fundamentalism has no place in the Islamic scheme of life. It is quite alien to Islamic thought. Now what is fundamentalism? Fundamentalism is only another name for extremism which ultimately assumes the form of fanaticism. And you know fanaticism is not only un-Islamic in nature but it is also a source of all kind of evil.

Now, fundamentalism or extremism is mentioned in the Quran and hadith as *Ghulu* or *Tashaddud*. *Ghulu* or *Tashaddud* is quite unwarranted in Islam. The Quran says: Do not be extremist in your religion (4:171). The Prophet of Islam has said: "You have to keep away from extremism in religion. For, previous religious communities had perished only because of their extremist attitude in religion. (*Ahmad, Ibn Majah, An Nasai*).

Then there is another *hadith* in which the Prophet of Islam has warned: "Do not adopt a hard-line approach in your affairs, otherwise you will have to face harder conditions (*Abu Dawood*). And it is a fact that hardline approach always proves to be counter productive.

Now, let's make some comparisons between Islam and fundamentalism. Islamic thinking towards others is based on tolerance, whereas fundamentalist thinking towards others is based on intolerance. Islam believes in persuasion, whereas fundamentalism believes in coercion. The Islamic ethic is one of love and compassion whereas the fundamentalist ethic is one of hatred and enmity. Islam always adopts peaceful methods, whereas fundamentalists adopt violent methods. In controversial

matters, Islam always advocates conciliatory approach whereas fundamentalists always advocate confrontational approach. So there is a vast difference between Islam and fundamentalism. To illustrate this difference I will give here some practical examples.

Suppose an author publishes a book and you feel that the book contains some material against your religion. Now, there are two different ways to deal with this situation. Islam would like to take it as an ideological challenge and prepare another book to counter it through reason and argument. But fundamentalists will take it as a conspiracy and will give a negative response, by attempting to burn the book and kill the author.

Let us take another example. If some Muslim women adopt western culture, in such a situation Islam will try to promote Islamic education among them whereas fundamentalists will not hesitate to take violent measures like inflicting severe punishment on them. Let us take another example. Suppose you are living in a Muslim country and you feel that your country is not being governed by *Shariah* laws. Now, the Islamic way would be to bring about change peacefully through gradual process. Whereas fundamentalists will attempt to overthrow the ruling class so that they may capture power and impose shariah law without delay. They fail to understand that this kind of brute radicalism can only produce jungle law, and not *shariah* law. These examples show that the Islamic approach and the fundamentalist approach are totally opposed to one another, both in theory as well as in practice. They cannot go together.

Conference on Fundamentalism and Communalism,
Dacca, June 2, 2001

لئے یہی کافی ہے کہ کبھی کسی صحابی نے ایسا نہیں کہا کہ میرا مقصد شہادت یا قیادت کا حصول ہے۔ یہ اسلام کے نام پر لیڈری ہے، اس سے زیادہ اس کی اور کوئی حقیقت نہیں۔

ڈھاکہ بنگلہ دیش کی راجدھانی ہے۔ ۱۹۴۷ میں یہ ایک معمولی قصبہ تھا۔ اب یہ ایک شاندار شہر بن چکا ہے۔ تاہم بنگلہ دیش کے آدھے سے زیادہ لوگ دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ وہ لوگ ابھی تک غربت کے ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اگر کوئی شخص یہاں کے ایک غریب دیہاتی کو دیکھ کر کہے کہ تم جھونپڑی میں کیوں زندگی گزار رہے ہو، ڈھاکہ کے شیریٹن ہوٹل میں ایک کمرہ کرایہ پر کیوں نہیں لے لیتے۔

یہ جملہ گرامر کے لحاظ سے بالکل درست ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ آخری حد تک غلط ہے۔ غریب دیہاتی کے لئے یہ معاملہ ایک ممکن اور دوسرے ممکن کے درمیان انتخاب کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ناممکن کے مقابلہ میں ممکن پر راضی ہونے کا معاملہ ہے۔

کسی غریب دیہاتی نے کبھی ایسی بات سوچی نہیں ہوگی۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں میں سے ہر ایک اسی قسم کی بات بول رہا ہے۔ اور بہت سے نادان لوگ تالیاں بجا کر اس کو مفکر اعظم کا خطاب دے رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے تقریباً ہر مسلم رہنما نے یہ کیا کہ قوم کو حقیقت کے بجائے خواب کی دنیا میں دوڑایا۔ ممکن کو چھوڑ کر ناممکن کے میدان میں سرگرم کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری مسلم دنیا میں عظیم لیڈر تو ضرور دکھائی دیتے ہیں مگر عظیم ملت کہیں نظر نہیں آتی۔

جیسا کہ معلوم ہے، بنگلہ دیش ۱۹۴۷ سے پاکستان کا حصہ تھا۔ جنوری ۱۹۷۲ میں پاکستان سے ٹوٹ کر وہ ایک علیٰحدہ ملک بنا۔ ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ جب یہ خبر آئی تو میں نے اپنی ڈائری میں اپنا ایک احساس تحریر کیا تھا جو الجمیعۃ ویکلی (نئی دہلی) کے شمارہ ۳۰ جون ۱۹۷۲ کے صفحۂ اول پر چھپا۔ اس کے الفاظ یہ تھے:

> میں نے لکڑی کو توڑا اور لکڑی ہمیشہ کے لئے دو ٹکڑے ہوگئی۔ میں نے سمجھا کہ میں نے اپنے حریف کو ختم کرنے کا نہایت قیمتی راز معلوم کرلیا ہے۔ مگر میں بھول گیا

کہ میرا حریف ایک زندہ وجود ہے، لکڑی نہیں ہے۔ میں لکڑی کو توڑ سکتا ہوں مگر میں ایک زندہ چیز کو نہیں توڑ سکتا۔ ایک امیبا (Amoeba) جب ٹوٹتا ہے تو وہ دو زندہ امیبا بن جاتا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ۱۹۸۴ نے اپنے بنگلہ دیش کے آرٹیکل کے تحت لکھا ہے کہ تیرہویں صدی میں تھوڑے سے مسلمانوں کی آمد نے اس علاقہ کے کیریکٹر کو مستقل طور پر بدل دیا۔ اس تبدیلی میں بڑا حصہ صوفیوں کا تھا''۔

The arrival of a handful of Muslims in Bengal at the begining of the 13th century permanently changed the character and culture of the area. There were several reasons for the increase in the Muslim population. Perhaps the most significant was the activity of ascetic divines and Sufi mystics, who won converts among the lower castes of the Hindus (2/690)

برٹانیکا کی اس بات کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ یہ بات غالباً صرف جزئی طور پر درست ہے۔ کیوں کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ صوفیاء کی تحریک نے اس علاقہ کے لوگوں کے مذہب کو تو بدلا مگر ان کے کلچر اور ان کے رسم ورواج کو وہ بہت کم بدل سکے۔ اس کے نقصانات مختلف صورتوں میں آج تک ظاہر ہورہے ہیں۔ یہاں کا اسلام پسند طبقہ جو اقلیت میں ہے، وہ اس صورت حال کو سیاسی طاقت کے زور پر بدلنا چاہتا ہے۔ مگر اس صورت حال کو صرف تعلیم کے ذریعہ بدلا جاسکتا ہے، کوئی دوسرا ذریعہ اس کو بدلنے کا نہیں۔

بنگلہ دیش کا ایک خاص ایڈوانٹج یہ ہے کہ اس کی تقریباً پوری آبادی صرف ایک زبان بولتی ہے، یعنی بنگلہ زبان۔ اس اعتبار سے وہ انڈیا اور پاکستان دونوں سے زیادہ بہتر پوزیشن میں ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ صرف ایک زبان کے ذریعہ پوری قوم کو خطاب کیا جاسکے۔ کمیونی کیشن کے جدید دور میں لسانی یکسانیت کسی قوم کا ایک عظیم سرمایہ سمجھی جاتی ہے اور یہ قیمتی سرمایہ بنگلہ دیش کو پوری طرح حاصل ہے۔ ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے میں نے اپنے اس خیال کا

اظہار کیا تو انہوں نے اس سے پوری طرح اتفاق کیا۔

بنگلہ دیش کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کی آبادی میں تقریباً ۱۵ فیصد ہندو ہیں۔ ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ بنگلہ دیش کے مذہبی طبقہ نے اپنی محدود سوچ کی بنا پر ان ہندوؤں کو ابھی تک صرف ایک مسئلہ سمجھا ہے۔ حالانکہ وہ بنگلہ دیش کے لئے ایک ایڈوانٹج ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے سماج میں چیلنج اور مسابقت کی حالت پیدا ہوتی ہے۔ اور چیلنج اور مسابقت کے بغیر کوئی قوم کبھی ترقی نہیں کرسکتی۔

عام طور پر بنگلہ دیش کو ایک غریب ملک سمجھا جاتا ہے اور اس کا سبب جغرافی ناموافقت ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ ایک غلط توجیہہ ہے۔ جغرافی ناموافقت اس دنیا میں کوئی مسئلہ نہیں۔ عرب کو ہزاروں سال سے ایک صحرائی ملک سمجھا جاتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں معلوم ہوا کہ اس "بے آب" سرزمین کے نیچے تیل کا قیمتی چشمہ رواں ہے۔ یہی معاملہ بنگلہ دیش کا ہے۔ بنگلہ دیش کے اس بظاہر غیر موافق جغرافیہ کے اندر نیچرل گیس کے بھاری ذخیرے دریافت ہوئے ہیں جن کو اگر ملک کے لئے درست طور پر استعمال کیا جائے تو وہ بنگلہ دیش کو ایک دولت مند ملک بنانے کے لئے کافی ہیں۔

کچھ لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ بنگلہ دیش کی اصل کمی یہاں کی جذباتی قیادت ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہاں تقسیم کا ہنگامہ جاری رہا۔ اس کے بعد ۱۹۶۷ سے یہاں آزاد بنگلہ کے ہنگامے جاری ہوئے۔ اب کچھ لوگ اسلامی بنگلہ کے نام پر یہاں نیا ہنگامہ کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ ان ہنگاموں کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ یہاں مسلسل باقی رہنے والا کوئی تعمیری عمل جاری نہ ہوسکا۔ یہی بنگلہ دیش کا بلکہ تمام مسلم ملکوں کا اصل مسئلہ ہے۔ میں نے کہا کہ کامیابی نام ہے، مستقل کوشش کے نتیجہ کا، مگر یہی چیز مسلم ملکوں میں موجود نہیں۔

تقسیم کے بعد ہندستان کے مسلمانوں کی کچھ تعداد مشرقی پاکستان چلی گئی تھی، ان میں سے ڈھائی لاکھ اب بھی بنگلہ دیش کے مہاجر کیمپوں میں آباد ہیں۔ وہ غیر ملکی کی حیثیت سے یہاں

رہتے ہیں۔ یہاں کے کچھ لوگوں سے ان کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ ان لوگوں کے بارے میں تفصیل معلوم ہونے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس المیہ کی ابتدائی ذمہ داری خود انہی اردو خواں مہاجرین پر ہے۔ وہ اپنے کلچر کی برتری کے احساس میں مبتلا تھے اور بنگالیوں کے کلچر کو حقیر سمجھتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں بہت سے مسائل پیدا ہوئے۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۹ء میں ڈھاکہ میں سخت قسم کا فساد ہوا جس میں بنگالی مسلمان اور مہاجر مسلمان ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ اس فساد کا سبب یہ تھا کہ مہاجرین نے یہ مطالبہ کیا کہ انتخابات کے لئے ووٹر کا فارم اردو میں بھی مہیا کیا جائے۔ بنگالیوں نے اس سے اختلاف کیا۔ ان کا یہ مطالبہ تھا کہ یہ مہاجر بنگلہ زبان سیکھیں۔ اس پر شدت بڑھی۔ یہاں تک کہ دونوں کے درمیان خونی فساد کی نوبت آ گئی۔

میرے نزدیک حقیقت پسندانہ بات یہ تھی کہ مہاجرین جب یہاں آئے ہیں تو وہ خود یہاں کی زبان سیکھیں، نہ کہ اپنی زبان دوسروں کے اوپر مسلط کرنے کی کوشش کریں۔

پاکستان میں ۱۹۷۰ میں عام انتخابات ہوئے تو اس میں وہ صورت پیدا ہوگئی جس کو میں نے اپنے ایک مضمون میں ایک ملک دو فاتح (الجمعیۃ ویکلی، ۱۵ جنوری ۱۹۷۱) کے عنوان کے تحت لکھا تھا۔ اس الیکشن میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو مغربی پاکستان کے بیشتر ووٹ ملے اور مشرقی پاکستان کے تقریباً تمام ووٹ شیخ مجیب الرحمٰن کے حصہ میں آئے۔ اب دونوں پرائم منسٹر بننے کے دعویدار ہو گئے۔ اس طرح پاکستان میں ایک ملک دو فاتح کی صورت حال پیدا ہوگئی۔ دونوں میں سے کوئی بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہاں تک کہ ملک بٹ گیا تاکہ دونوں میں سے ہر ایک کو پرائم منسٹر کی سیٹ مل سکے۔

ایک پاکستانی مسلمان سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ کشمیر کی بے فائدہ جنگ آپ لوگ کیوں چلا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم انڈیا سے بنگلہ دیش کا بدلہ لے رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر بالفرض انڈیا نے پاکستان کو دو ٹکڑے کر کے بنگلہ دیش بنوایا ہو تب بھی آپ کے لئے یہ عقل مندی کی بات نہیں۔ اس معاملہ میں دانش مندانہ سوچ یہ ہے کہ آپ اپنے عوام کو یہ

بتائیں کہ اگر انڈیا نے ۱۹۷۱ میں ہمارے ملک کو دو ٹکڑے کیا تو ہم بھی اس سے پہلے ۱۹۴۷ میں ان کے ملک کو دو ٹکڑے کر چکے تھے۔ اس لیے اب معاملہ برابر ہو گیا۔ لہذا اب ماضی کی بات کو چھوڑو، اب اپنی ساری توجہ مستقبل کی تعمیر میں لگا دو۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو بہت مشکل فارمولا ہے۔ میں نے کہا کہ جاپان نے دوسری عالمی جنگ کے بعد اسی مشکل فارمولا کا استعمال کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اقتصادی سپر پاور بن گیا۔ کسی بڑی ترقی کا راز ہمیشہ مشکل فارمولا میں ہوتا ہے، نہ کہ آسان فارمولا میں۔

۱۹۴۷ میں ڈھاکہ صرف ایک قصبہ کی مانند تھا۔ آج ڈھاکہ بہت بڑا شہر ہے جو صاف ستھری سڑکوں اور خوبصورت مکانات کی صورت میں کھڑا ہوا ہے۔ ہریالی کی کثرت نے اس کی شان میں اور زیادہ اضافہ کیا ہے۔ تاہم یہاں امیر و غریب کا فرق ہندستان سے زیادہ نمایاں ہے۔ یہاں کی سڑکوں پر چلتے ہوئے یہ بات نہایت واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ سڑکوں پر یا تو بڑی بڑی شاندار گاڑیاں نظر آئیں یا پھر اسکوٹر اور سائیکل رکشا دکھائی دئے۔ ایک صاحب سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا کہ بنگلہ دیش میں یا بہت زیادہ امیر لوگ ہیں یا بہت زیادہ غریب لوگ۔ یہاں کی آبادی میں درمیانی لوگ کم پائے جاتے ہیں۔

ایک تجربہ گزرا۔ اس سے ایک نفسیاتی حقیقت میری سمجھ میں آئی۔ وہ یہ کہ انسان کے دماغ میں پیدائشی طور پر ہر صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ مگر وہ صرف اس وقت متحرک ہوتی ہے جب کہ کوئی طاقتور جذبہ اس کو متحرک کرنے کے لئے موجود ہو۔ یہ طاقتور جذبہ دو میں سے کوئی ایک ہوسکتا ہے، یا تو کسی چیز کا بہت زیادہ ڈر یا کسی چیز کا بہت زیادہ شوق۔

ڈھاکہ میں ایک اسلام پسند مسلمان سے ایک سیکولر مسلمان کا ذکر ہوا۔ اسلام پسند مسلمان نے فوراً کہا کہ وہ تو اسلام دشمن آدمی ہیں۔ اس کے بعد جب سیکولر مسلمان سے مذکورہ اسلام پسند کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا کہ وہ تو انسانیت دشمن آدمی ہیں۔ یہی صورت حال آج پوری مسلم دنیا میں موجود ہے۔ آج کی دنیا کے تقریباً تمام مسلمان وسیع تقسیم میں دو خیموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ سیکولر

خیمہ اور اسلامی خیمہ۔ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں مبالغہ آمیز قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی کسی کا دشمن نہیں۔ یہ صرف طرزِ فکر کا مسئلہ ہے۔ ایک طبقہ روایتی اصطلاحوں میں سوچتا ہے اور دوسرا طبقہ غیر روایتی اصطلاحوں میں۔ اور بالفرض اگر ان میں سے کوئی کسی کا دشمن ہو تب بھی قرآن کی ہدایت کے مطابق، ہمارا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم بدگمانی میں پڑے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ سنجیدہ ڈسکشن کریں۔ اتفاق اور اختلاف سے بلند ہو کر ایک دوسرے کے بارے میں ہمدردانہ رائے قائم کریں۔

ڈاکٹر محمد نصیر الدین صاحب (پیدائش ۱۹۴۹) سے ۳ جون کی صبح کو ملاقات ہوئی۔ وہ اسلامک یونیورسٹی بنگلہ دیش میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبہ میں استاد ہیں۔ یہ یونیورسٹی اب کشتیا میں ہے۔ آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (OIC) کے تحت تین یونیورسٹیاں قائم ہوئی تھیں۔ ایک بنگلہ دیش میں، دوسری اسلام آباد میں اور تیسری کوالالمپور میں۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں کی اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ انڈیا سے کچھ مختلف ہے۔ انڈیا میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبہ میں اسلام کی ہسٹری اور کلچر پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور بنگلہ دیش میں تھیالوجی پر زور ہے۔ کریکولم جو ڈزائن کیا جاتا ہے اس میں یہ فرق ہوتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ بنگلہ دیش میں اب تعلیم کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

ایک تجربہ گزرا، جس کے بعد میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں ۹۹ فیصد سے زیادہ انسان کسی نہ کسی قسم کے اَمانی (فرضی) تمناؤں میں جی رہے ہیں۔ اس دنیا میں کامیاب انسان وہ ہے جو حقیقی یقین پر کھڑا ہو سکے مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج کی دنیا میں چند خوش نصیب روحوں کے سوا کسی کو بھی حقیقی یقین کا سرمایہ حاصل نہیں۔

کچھ لوگ مادی سروسامان کے بھروسہ پر جی رہے ہیں، حالانکہ مادی سروسامان سے زیادہ بے بھروسہ چیز اور کوئی نہیں۔ کچھ لوگوں نے جھوٹی کہانیوں کی بنیاد پر ایک پراسرار دنیا بنا رکھی ہے۔ اور اس کے ذریعہ ایک فرضی یقین حاصل کر کے اس میں جی رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کے پاس تاریخ

کی پر عظمت کہانیاں ہیں۔ مگر اس قسم کی چیزیں محض ذہن کو خوش کرنے کے لیے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

ڈھاکہ کے مشہور بنگلہ اخبار روزنامہ جنکنتھا (Janakantha) کے نمائندہ مسٹر نور عالم نے انٹرویو لیا۔ یہ بنگلہ دیش کا سب سے بڑا اخبار ہے۔ ان کا ایک سوال یہ تھا کہ ۱۹۷۱ میں بنگلہ دیش نے آزادی کی جولڑائی لڑی اس وقت کچھ لوگوں نے کھلے طور پر پاکستان کا ساتھ دیا تھا۔ یہ لوگ بلا شبہہ جنگی مجرم ہیں۔ پھر ان کے خلاف غداری کا مقدمہ کیوں نہ چلایا جائے۔ میں نے کہا کہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے اس موقع پر پاکستان کا ساتھ دیا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ اگر انتقام کی کارروائی چلائیں تو یہ کارروائی کبھی ختم نہ ہوگی۔ اس کو ختم کرنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو معاف کر دیا جائے۔ آپ ماضی کو بھلا دیں اور مستقبل کی طرف دیکھیں۔ ماضی کی طرف دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مستقبل کی تعمیر کا سفر ہی شروع نہ ہو سکے گا۔

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اللہ نے کچھ مچھلیاں بنائیں اور پھر ان کو پانی کے باہر خشکی پر ڈال دیا۔ صرف اس لئے تاکہ وہ ساری زندگی تڑپتی رہیں اور آخر میں پھر اللہ کی رحمت سے ان کو پانی میں ڈال دیا جائے۔

شاید ایسا ہی کچھ معاملہ اہل جنت کا بھی ہے۔ جنت غالباً ان لوگوں کے لئے ہے جن کا مزاج کچھ اس طرح کا بنا دیا گیا ہو کہ وہ اصول کو چھوڑ کر سمجھوتہ والی زندگی گزارنے پر راضی ہی نہ ہوں۔ اور اس کے نتیجہ میں ساری عمر مصیبت اٹھاتے رہیں۔ یہاں تک کہ آخر میں اللہ ان پر رحم کرے اور فرشتوں کو حکم دے دے کہ میرے ان بندوں کو جنت میں داخل کر دو۔ وہ دنیا میں بہت دکھ اٹھا چکے، اب آخرت میں ان کو دکھ دینا مجھے منظور نہیں۔

ایک کشمیری پروفیسر نے ایک عبرت انگیز قصہ بتایا۔ کشمیر میں ایک جاہل آدمی جو محنت مزدوری کا کام کرتا تھا، ایک دن اچانک اس نے اعلان کیا کہ رسول اللہ مجھ کو خواب میں آئے اور کہا کہ تم کو شہادت مبارک ہو۔ اس کے بعد اس نے محنت مزدوری کا کام چھوڑ کر جنگجوئی کا

''پروفیشن'' اختیار کرلیا۔ اب وہ لوگوں کے درمیان عسکری لیڈر بن کر گھومنے لگا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ شخص تو بالکل جاہل ہے اور وہ ہمارا لیڈر بننا چاہتا ہے۔ ایک روز وہ جمعہ کے دن مسجد میں داخل ہوا۔ اس وقت امام خطبہ دے رہا تھا۔ بندوق بردار عسکری لیڈر نے بلند آواز سے کہا کہ امام صاحب رک جایئے، مجھ کو ایک ضروری بات کہنا ہے۔ اس نے کہا کہ میرے خلاف پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ میں پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں۔ مجھے یہ بتایئے کہ رسول اللہ نے کس مدرسہ میں پڑھا تھا۔ تمام حاضرین نے سر جھکا لیا۔ اور اس طرح گویا بندوق بردار عسکری لیڈر کی بات کی خاموش تصدیق کی۔

پاکستان سے آنے والے ایک ڈیلی گیٹ نے بتایا کہ پاکستان میں اس وقت یہ صورت حال ہے کہ وہاں آپ نہایت آسانی سے دیواروں پر ایسا پوسٹر دیکھ سکتے ہیں جس پر لکھا ہوگا: جنت میں جانے کا سب سے قریبی راستہ، شہادت۔ اسی طرح کسی اور پوسٹر میں لکھا ہوگا: جتنا بڑا خاندان اتنے ہی زیادہ مجاہد۔

یہ کوئی اسلامی سوچ نہیں، وہ ایک قومی جنون ہے۔ بدقسمتی سے یہ قومی جنون اس وقت ساری مسلم دنیا میں پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ زبان سے اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، اور کچھ لوگ عملاً جہاد وشہادت کے اس میدان میں کود پڑے ہیں۔

مسلم دنیا میں یہ مجنونانہ سوچ کیوں ہے۔ ایک پروفیسر نے بجا طور پر کہا کہ موجودہ مسلمان ساری دنیا میں احساس شکست (defeatist mentality) کا شکار ہیں۔ اس قسم کی منفی باتیں اسی مایوسانہ ذہن سے نکلی ہیں، نہ کہ مثبت طور پر قرآن وسنت کے مطالعہ سے۔

ایک صاحب سے میں نے سوال کیا کہ موجودہ دنیا میں مسلمان دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان ایک بلا اعلان جنگ جاری ہے۔ ایک طبقہ وہ جس کو اسلام پسند طبقہ کہا جاتا ہے اور دوسرا طبقہ وہ جس کو سیکولر طبقہ کہا جاتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس صورت حال کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ دراصل اسلام پسند طبقہ کی ناکامی کا نتیجہ

ہے۔ وہ اسلام کے نام پر نعروں کی سیاست چلاتے رہے۔ مگر انہوں نے اسلام کو آج کے انسان کے لیے قابل فہم نہیں بنایا۔ اسی کے ردعمل میں سیکولر طبقہ پیدا ہوا۔

میرے ساتھ الرسالہ کی انگریزی مطبوعات تھیں وہ یہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں میں دی گئیں۔ اکثر لوگوں نے خود ان کتابوں کی خواہش ظاہر کی۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: پروفیسر غلام اعظم خاں، ائر مارشل اصغر خاں، مسٹر شہریار کبیر، پروفیسر ریاض پنجابی، پروفیسر عالیہ امام، ڈاکٹر محمد نصیر الدین، مسٹر ہرن موائے کالیلکر، ڈاکٹر شمبھو پرشاد، پروفیسر حمزہ علوی، مسٹر محمد حسن، وغیرہ۔

پاکستان سے آنے والے پروفیسر دانی نے اپنی تقریر میں بتایا کہ ان کی تعلیم بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہوئی۔ ایک روز وہ بنارس کے وشوناتھ مندر میں گئے۔ وہاں ان کے ماتھے پر تلک کا لال نشان لگا دیا گیا۔ اس کے بعد وہ قریب کی مسجد میں گئے تو وہاں ان کو یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ تم ہندو ہو۔ وہ باہر گئے اور ماتھے کا لال نشان دھوکر دوبارہ مسجد میں آئے تو انہیں مسجد میں داخلہ کی اجازت مل گئی۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ بھی کیسا عجیب مذہب ہے کہ بدن کے کسی حصہ پر ایک نشان لگ جائے تو آدمی کسی اور مذہب کا بن جائے اور اگر وہ نشان پانی سے دھودیا جائے تو وہ دوسرے مذہب کا ہو جائے۔

نیپال سے آئے ہوئے ایک ڈیلی گیٹ نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''ہندو نیپال'' میں مسلمان سیکولر ہندستان سے زیادہ محفوظ ہیں:

Muslims in Hindu Nepal are more safe than in secular India.

میں نے کہا کہ یہ ایک غلط تقابل ہے۔ یہ تقابل اس وقت درست ہوتا جب کہ نیپال کے مسلمانوں نے تقسیم کی تحریک چلا کر نیپال کو دو ٹکڑے کیا ہوتا۔ جب وہ جلسہ جلوس کی سیات چلا کر نیپال کے ہندوؤں سے رقیبانہ اور حریفانہ تعلق قائم کر لیتے۔ جب کہ نیپال میں یہ کہانیاں ہوتیں کہ مسلم حکمرانوں نے مندر کو توڑ کر مسجد بنالیا، وغیرہ۔ موجودہ نیپال اس قسم کی تمام باتوں سے خالی

ہے اس لیے اس کا تقابل موجودہ ہندستان سے درست نہیں ہوسکتا۔ میں نے کہا کہ آپ ہندستان میں نیپال جیسی فضا بنا دیجئے، اس کے بعد آپ کو دونوں ملکوں میں کوئی فرق دکھائی نہ دے گا۔

بنگلہ دیش کے اس سفر میں وہاں کے ایک مسلم نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ روانی کے ساتھ اردو بولتے تھے اور ان کے خیالات بھی نسبتاً معتدل تھے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ اتنی صاف اردو کیسے بولتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ پہلے میں صرف بنگلہ زبان جانتا تھا اور اردو سے بالکل ناواقف تھا۔ اس کے بعد میں تعلیم کے لئے دہلی گیا اور وہاں چند سال رہ کر جامعہ ملیہ کے اسلامک اسٹڈیز میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ اس قیام کے دوران میں نے اردو زبان سیکھ لی۔ مزید یہ کہ دہلی جانے سے پہلے میرے خیالات میں جو شدت تھی وہ بھی ختم ہوگئی۔

اس تجربہ کے بعد مجھے پاکستان کے سابق صدر جنرل محمد ایوب خاں کی بات یاد آئی۔ انہوں نے اپنی کتاب آقا نہیں، دوست (friends, not masters) میں لکھا تھا کہ مشرقی پاکستان ۲۵ سال کے اندر الگ ہو جائے گا۔ اس انجام سے بچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے لوگوں میں انٹگریشن (integration) پیدا کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک منصوبہ یہ تھا کہ پاکستان میں بڑے پیمانہ پر ایک انٹرنیشنل یونیورسٹی بنائی جائے۔ اس میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے نوجوان ایک ساتھ تعلیم حاصل کریں۔ اس میں تعلیم پاکر دھیرے دھیرے ایک نئی نسل پیدا ہوگی، اور دونوں نسل کے درمیان وہ بُعد بڑی حد تک ختم ہو جائے گا جو ان کے درمیان آج پایا جاتا ہے۔

محمد ایوب خاں اس معاملہ میں اتنے زیادہ سنجیدہ تھے کہ انہوں نے پاکستان کے اسلام پسند لیڈروں کو یہ پیش کش کی کہ پاکستانی حکومت ایک اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹی قائم کر کے اس کا مکمل انتظام آپ کے حوالہ کردے گی۔ آپ لوگ اس یونیورسٹی کو چلائیں اور اس کے ذریعہ ایک نئی نسل پیدا کریں۔ مگر یہ اسلام پسند لیڈر جو میرے نزدیک تدبر کی صفت سے خالی تھے وہ اس منصوبہ کی اہمیت کو سمجھ نہ سکے۔ انہوں نے یونیورسٹی کے منصوبہ کو چھوڑ کر نام نہاد اسلامی سیاست چلائی اور مس

فاطمہ جناح کے ساتھ شامل ہو کر صدر محمد ایوب خاں کو سیاسی شکست دینے کی کوشش کی جس میں وہ مکمل طور پر ناکام رہے۔ یہ نام نہاد اسلام پسند لیڈر جب صدر محمد ایوب کو انتخابی شکست دینے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے ان کے خلاف بدنامی اور تخریب کاری کی مہم چلا دی۔ یہاں تک کہ صدر ایوب کو صدارت سے ہٹنا پڑا، ایک تاریخ ساز منصوبہ پورا ہونے سے رہ گیا۔

ڈھاکہ کے انگریزی اور بنگلہ اخباروں میں کانفرنس کی رپورٹیں باتصویر تفصیل کے ساتھ شائع ہوئیں۔ اخبار کے علاوہ ٹی وی پر بھی برابر اس کی خبریں آتی رہیں۔ بنگلہ ٹی وی نے میرا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ہندستان میں فرقہ واریت کا زور اب بہت کم ہو گیا ہے۔ انٹرویور نے کہا کہ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں جب کہ ۱۹۹۲ میں انڈیا کے کٹر ہندوؤں نے بابری مسجد کو ڈھا دیا۔ میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے مگر مسجد کے ڈھانے کے ساتھ انہوں نے خود اپنے آپ کو بھی ڈھا دیا:

> Yes, they have demolished the mosque but along with it they have demolished themselves.

ڈھاکہ کے مشہور بنگالی اخبار (Prothom Alo) نے میری تقریر کا خلاصہ شائع کیا۔

۱۹۴۶ میں جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ برصغیر ہند کو تقسیم ہونا ہے تو اس وقت مہاتما گاندھی نے مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) جانے کا فیصلہ کیا جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مارکاٹ شروع ہو گئی تھی۔ وہ لمبی مدت تک نواکھلی کے دیہاتوں میں گھوم کر لوگوں کو امن کا پیغام دیتے رہے۔ کسی نے کہا کہ آپ کا جو مشن ہے اس کے لئے آپ پاکستانی لیڈر محمد علی جناح سے کیوں نہیں ملتے۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ لیڈر تو عوام کے تابع ہوتا ہے۔ عوام اگر امن پسند ہو جائیں تو لیڈر کو بھی امن پسند بننا پڑے گا۔ اس معاملہ میں صرف لیڈر سے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

اسی زمانہ میں ۵ دسمبر ۱۹۴۶ کو انہوں نے اپنے قلم سے یہ تاریخی الفاظ لکھے کہ:

My present mission is the most difficult and complicated one of my life.....I am prepared for any eventuality. 'Do or die' has to be put to the test here. 'Do' here means Hindus and Musalmans should

learn to live together in peace and amity. Otherwise, I should die in the attempt (p.449)

میرا موجودہ مشن میری زندگی کا بہت زیادہ مشکل اور پیچیدہ مشن ہے۔ میں کسی بھی متوقع صورت حال کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ یہ 'کرو یا مرو' کا امتحان ہے۔ اس معاملہ میں کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ سیکھنا ہوگا کہ وہ کس طرح مل جل کر امن کے ساتھ رہیں، ورنہ میں اسی کوشش میں اپنی جان دے دوں گا۔

کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے مجھے کئی انگریزی کتابیں ہدیہ کے طور پر دی گئیں۔ ان کتابوں سے بنگلہ دیش کے سیکولر طبقہ کے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں:

Tormenting Seventy One edited by Shahariar Kabir,
Resist Fundamentalism edited by Shahariar Kabir,
Of Blood and Fire Jahanara Imam and
The Vanquished Generals and the Liberation War by Muntassir Mamun of Bangladesh

ان کتابوں میں مشترک طور پر یہ بتایا گیا تھا کہ ۱۹۷۱ کی جنگ میں پاکستانیوں نے بنگلہ دیشیوں کے ساتھ کتنا زیادہ بے رحمی، اذیت اور دہشت (cruelty, torture, terror) کا مظاہرہ کیا۔

ان میں سے ایک کتاب Of Blood and Fire کے ٹائٹل پر خوشونت سنگھ کا تبصرہ درج کیا گیا تھا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اس کتاب میں جن دہشت ناک مظالم کا ذکر ہے وہ کسی مبالغہ کے بغیر درست ہیں:

> The record Jahanara Imam maintained
> are neither hyperbolic nor exaggerated.

اس کے بعد مسٹر خوشونت سنگھ نے لکھا:

I wish I could have presented General Tikka Khan with a copy of 'OF Blood and Fire'. It explains why the Awam of East Pakistan turned against west Pakistan.

بنگلہ دیش میں قیام کے زمانہ میں مجھ کو جو معلومات حاصل ہوئیں اس سے میں نے یہ سمجھا

کہ بنگلہ دیش میں بھی تقریباً وہی صورت حال ہے جو پاکستان میں پائی جاتی ہے۔ دونوں ملکوں کے مسلمان دو طبقوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں ـــــــ اسلام پسند گروہ اور سیکولر گروہ، دونوں ایک دوسرے کے خلاف بے رحمانہ حد تک شدید احساسات رکھتے ہیں۔ سیکولر گروہ اسلام پسندوں کو غیر ملکی ایجنٹ سمجھتا ہے۔ دوسری طرف اسلام پسندوں کا یہ حال ہے کہ ایک اسلام پسند تاجر نے بنگلہ دیش کے سیکولر افراد کو شبہہ کافر (Semi Kafir) قرار دیا۔

عجیب بات ہے کہ یہی مسلمان ہندستان میں نسبتاً مل جل کر رہ رہے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہندستان میں غیر مسلم اکثریت کا دباؤ ہے۔ اس طرح پورے برصغیر ہند کے مسلمان یورپ اور امریکہ میں پر امن طور پر رہ رہے ہیں۔ اس کا سبب یقینی طور پر یہی ہے کہ وہاں انہیں غیر مسلم اقتدار کے دباؤ کے تحت رہنا پڑتا ہے۔ اس بات کا ذکر میں نے ایک صاحب سے کیا تو ان کا تبصرہ یہ تھا۔ یہ مسلمان اللہ سے نہیں ڈرتے مگر وہ اللہ سے نہ ڈرنے والوں سے ضرور ڈرتے ہیں۔

۳ جون کی صبح کو واپسی کا دن تھا۔ صبح کو حسب معمول دو رکعت نماز پڑھ کر یہ دعا کی کہ: **اللهم انت الصاحب فی السفر وانت الخليفة فی الاهل**۔ اس کے بعد ہوٹل شرٹین سے صبح ۹ بجے روانہ ہو کر ہم لوگ ڈھاکہ ائرپورٹ پہنچے۔ مجھے میرے ساتھی نے ائرپورٹ کے لاؤنج میں بٹھا دیا۔ اور خود رسمی کارروائی کو انجام دے کر مجھے بورڈنگ پاس دیا اور کہا کہ اب آپ ہوائی جہاز کے اندر داخل ہو کر اپنی سیٹ لے سکتے ہیں۔ میرے دل نے کہا کہ کاش آخرت میں بھی ایسا ہی ہو اور اللہ کے فرشتے مجھے وہاں کی کارروائی سے بچا کر کہیں کہ جاؤ، اب ابدی جنت میں داخل ہو جاؤ۔

ڈھاکہ سے کلکتہ کا سفر ومان بنگلہ دیش کے ذریعہ ہوا۔ اس بار جہاز بھی اچھا تھا اور اس کی سروس بھی بہتر تھی۔ ہم لوگ تقریباً ساڑھے ۱۲ بجے کلکتہ ائرپورٹ پر اتر گئے۔

۳ جون کی شام کو کلکتہ ائرپورٹ پر جہاز کے انتظار میں لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے

قریب ایک تاجر اپنے موبائل ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے سنائی دئے۔ وہ غالباً اپنے منیجر کو کسی معاملہ میں ہدایت دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنی انگریزی گفتگو میں کئی بار یہ جملہ دہرایا:

You have to be very friendly.

ایک تاجر اس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے گاہک کو کھودے۔ اس لئے وہ اپنے گاہک کے ساتھ آخری حد تک دوستانہ انداز اختیار کرتا ہے۔ یہی معاملہ مومن کا ہے۔ مومن اپنی جنت کو کھونے کا تحمل نہیں کرسکتا۔ اس لئے وہ لوگوں کے ساتھ آخری حد تک انسانی خیر خواہی کا معاملہ کرتا ہے کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اگر اس نے انسانوں کے ساتھ احسان کا معاملہ نہیں کیا تو اللہ بھی اس کے ساتھ احسان کا معاملہ نہیں کرے گا۔

ڈھاکہ اور کلکتہ کے درمیان پرواز کرتے ہوئے ویمان بنگلہ دیش کا جہاز تیزی سے ہلنے لگا اور نیچے اوپر ہونے لگا۔ اس کو دیکھ کر ایک مسافر نے کہا: کیسا پائلٹ ہے، کتنا خراب جہاز چلا رہا ہے۔ مگر یہ مسافر کی غلط فہمی تھی۔ اس معاملہ کا تعلق پائلٹ سے نہیں تھا بلکہ موسم سے تھا۔ جہازوں میں اکثر ایسا پیش آتا ہے۔ اصطلاح میں اس کو اپ ڈرافٹ، ڈاؤن ڈرافٹ (updraft, downdraft) کہتے ہیں۔

مجھے کئی بار اس طرح کی صورت حال سے سابقہ پیش آیا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ جہاز اتنی تیزی کے ساتھ اوپر سے نیچے آتا تھا جیسے کہ وہ زمین پر گر پڑے گا۔ مگر پرواز کی دنیا میں اس کو خطرناک نہیں سمجھا جاتا۔ اب تک غالباً کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا ہے جب کہ اس قسم کا موسمی معاملہ پیش آنے کی وجہ سے جہاز زمین پر گر پڑا ہو۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ غلط فہمی کیسی عجیب چیز ہے۔ وہ کسی معاملہ میں ایک ایسے شخص کو ذمہ دار سمجھ سکتی ہے جس کا کوئی بھی تعلق اس معاملہ سے نہ ہو۔

کلکتہ ائر پورٹ پر یہاں سے چھپنے والے ٹائمس آف انڈیا کا ایڈیشن (۳ جون ۲۰۰۱) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون اس عنوان کے تحت شائع ہوا تھا:

What is Colour Blindness?

اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ رنگ کا اندھا پن کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ آنکھ مین بنیادی طور پر ۳ رنگوں کو دیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ان ۳ رنگوں کے امتزاج سے مزید رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ اگر کسی رنگ کو دیکھنے والی نس کسی وجہ سے کام نہ کرے تو آدمی کو وہ رنگ دکھائی نہیں دے گا۔ اسی صورت حال کو رنگ کا اندھا پن کہا جاتا ہے:

On the refine there are three types of colour-sensitive cones each possessing its own photosensitive substance, one type responding to red, another to green and yet another to violet light. These are primary colours whose combinations makes different colours. The different colour sensations are produced by stimulation of various combinations of these receptors. When these cones become insensitive towards some colour, that colour is unable to stimulate that particular cone and the eye can not identify that colour. This state is known as colour blindness. Colour blindness was first described by Joseph Huddart in 1777 at Maryport.

ڈھاکہ سے کلکتہ تک ویمان بنگلہ دیش کے ذریعہ سفر ہوا۔ اور کلکتہ سے دہلی تک جٹ ائرویز کے ذریعہ۔ دونوں کے اوقات میں اتنا زیادہ فرق تھا کہ مجھ کو تقریباً چھ گھنٹہ کلکتہ ائرپورٹ پر گزارنا پڑا۔ مگر یہ وقت نہایت آسانی سے گزر گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اس وقت کے لئے ایک ضروری مشغلہ تلاش کرلیا۔ اور وہ سفرنامہ کو مرتب کرنا تھا۔ سفر کے دوران میں نے یادداشت کی صورت میں اشارے لکھ لئے تھے مگر سفرنامہ مرتب نہیں ہوا تھا۔ ان اشاروں کی مدد سے سفرنامہ تیار ہوتا رہا۔ اور اس طرح انتظار کے یہ لمبے لمحات نہایت آسانی کے ساتھ گزر گئے۔

۳ جون ۲۰۰۱ کی شام کو ۸ بجے کلکتہ سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ سفر جٹ ائرویز کی فلائٹ کے ذریعہ طے ہوا۔ یہ سفر ۲ گھنٹہ سے کم مدت کا تھا۔ قدیم زمانہ میں دہلی اور کلکتہ کے درمیان کا سفر ندیوں کے ذریعہ کشتی پر طے ہوتا تھا۔ اس کے بعد ٹرین کے ذریعہ یہ سفر طے ہونے

لگا۔اب ہوائی جہاز کی ایجاد نے اس سفر کی مدت بہت گھٹا دی ہے۔تاہم یہ آخری حد نہیں۔خدا کی اس دنیا میں ایسا سفر بھی ممکن ہے جس میں آغاز واختتام کا فرق سرے سے ختم ہو جائے۔موت اور قیامت کے درمیان فاصلہ کے سوال کو اسی مثال کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ہم لوگ دہلی پہنچے تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔

۳۱ مئی ۲۰۰۱ کو جب کہ میں بنگلہ دیش گیا تب بھی نظام الدین میں ہمارے ٹیلیفون ناکارہ (dead) ہو رہے تھے۔۴ جون ۲۰۰۱ کو جب میں بنگلہ دیش سے واپس ہو کر دوبارہ نظام الدین پہنچا تب بھی یہاں کے ٹیلی فون ناکارہ پڑے ہوئے تھے۔میں نے معلوم کیا تو مجھے بتایا گیا کہ بارش کی وجہ سے یہاں کے ٹیلی فون خراب ہو گئے ہیں۔مگر جب میں بنگلہ دیش میں تھا تو وہاں دہلی سے زیادہ بارشیں ہو رہی تھیں مگر وہاں کے ٹیلیفون اچھی طرح کام کر رہے تھے۔ہم نے ڈھاکہ میں بہت سے لوگوں سے ٹیلی فون سے باتیں کیں اور دوسروں کے ٹیلی فون ہمارے پاس آئے مگر کبھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

اس فرق کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ کرپشن ہے۔ہندستان میں کرپشن اپنی آخری حد تک بڑھ چکا ہے۔اسی کا ایک نتیجہ خراب ٹیلی فون کی شکل میں یہاں کے عوام کو مل رہا ہے۔بنگلہ دیش میں کرپشن نسبتاً کم ہے، اس لئے وہاں ٹیلی فون اور دوسری چیزوں میں وہ بگاڑ دکھائی نہیں دیتا جو ہندستان میں دکھائی دیتا ہے۔

واپسی کے بعد ۱۶ جون ۲۰۰۱ کو یہ خبر آئی کہ ڈھاکہ کے قریب نرائن گنج میں حکمراں عوامی لیگ کے دفتر میں ایک طاقت ور بم پھٹا۔تقریباً ۵۲ آدمی ہلاک ہو گئے اور ۱۰۰ سے زیادہ زخمی ہوئے۔باہمی ٹکراؤ اور ہلاکت کا یہ سلسلہ بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن کے قتل (۱۹۷۵) سے شروع ہوا اور اب تک جاری ہے۔

آزادی دراصل گدی کی لڑائی کا دوسرا نام ہے ـــــــ سیاسی گدی کو پہلے دوسروں سے چھیننا، اور پھر اس کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے چھین جھپٹ شروع کر دینا۔

کسی سیاسی تحریک کی کامیابی کا راز یہ نہیں ہے کہ وہ قائم شدہ حکومت کو ختم کر دے۔ بلکہ اس کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ جب نئی حکومت بنے تو تحریک کے لیڈر اس پر راضی ہو جائیں کہ وہ یہاں بھی اسی اجتماعی سبق کو دہرائیں گے جس کو مسلمان روزانہ مسجدوں میں با جماعت نماز کی صورت میں دہراتے ہیں۔ یعنی اپنے میں سے ایک کو امام مقرر کر کے بقیہ تمام کا مقتدی بن جانا۔ ایک کو آگے کر کے دوسرے تمام لوگوں کا پیچھے کی صفوں میں چلے جانا۔

بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں سیاسی اقدامات کے قصے تو بہت سنائی دیتے ہیں مگر مذکورہ قسم کی سیاسی پسپائی کا واقعہ کوئی ایک بھی نہیں۔

دشمن سے مقابلہ کے وقت سیاسی فتح مطلوب ہوتی ہے۔ مگر جب دشمن زیر ہو جائے اور خود اپنے لوگوں سے معاملہ کرنے کا وقت آجائے تو اس وقت برعکس طور پر سیاسی پسپائی مطلوب ہو جاتی ہے۔

چشمہ کا سبق

۱۹۸۹ کے وسط میں میں نے کشمیر کا ایک سفر کیا۔ ایک روز میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سرینگر شہر کے باہر گیا۔ ہم لوگ ایک کھلی وادی میں تھے۔ سامنے پہاڑی سلسلے دکھائی دیتے تھے۔ ان پہاڑوں سے نکلنے والے چشمے میدان میں ہر طرف بہہ رہے تھے۔ میں اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ میں نے کہا کہ دیکھئے یہ سیکڑوں چشمے جو یہاں بہہ رہے ہیں، وہ فطرت کی زبان میں آپ کو ایک بے حد اہم پیغام دے رہے ہیں۔ وہ پیغام یہ ہے کہ ٹکراؤ سے اعراض کر کے اپنی زندگی کی تعمیر کرو۔

پھر میں نے کہا کہ ان بہتے ہوئے چشموں کے راستہ میں جگہ جگہ پتھر موجود ہیں۔ یہ پتھر بظاہر ان کے راستہ میں رکاوٹ ہیں۔ اگر یہ چشمے ایسا کریں کہ وہ پتھر کو توڑ کر سیدھ میں آگے جانا چاہیں تو ان کا سفر اچانک رک جائے گا۔ ان چشموں نے اس مسئلہ کا یہ فطری حل نکالا ہے کہ وہ پتھر کے دائیں یا بائیں مڑ کر آگے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کا راستہ ایک لمحہ رکے بغیر جاری رہتا ہے۔

یہ اہل کشمیر کے لئے فطرت کا ایک عظیم سبق ہے۔ آپ لوگوں کو چاہئے کہ سیاسی چٹانوں سے ٹکرانے کا ذہن ختم کر دیں اور ان سیاسی چٹانوں کی موجودگی میں جو مواقع آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں ان کو استعمال کریں۔

یہی انسان کے لئے اس دنیا میں کامیاب سفر کا واحد طریقہ ہے۔ جس طرح بہتے ہوئے چشمہ کے راستہ میں پتھر ہوتے ہیں اسی طرح ہر فرد اور ہر گروہ کے راستہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں موجود ہوتی ہیں۔ عقل مندی یہ ہے کہ آدمی پیش آنے والی رکاوٹوں سے نہ ٹکرائے، وہ رکاوٹوں سے اعراض کرتے ہوئے اپنا سفر مسلسل جاری رکھے۔ رکاوٹوں سے ٹکرانا سفر کو روک دینے کے ہم معنیٰ ہے۔ اس کے برعکس رکاوٹوں سے اعراض کرنا بلا توقف اپنے سفر کے لئے مواقع حاصل کرنا ہے۔

یہ اس دنیا کے لئے فطرت کا قانون ہے۔ اس قانون سے لڑنا خود فطرت کے نظام سے لڑنا ہے، اور کون ہے جو فطرت سے لڑ کر کامیاب ہو سکے۔

معذوری کے باوجود

جولائی ۲۰۰۱ میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے میں نے سوئزرلینڈ کا سفر کیا۔ یہاں میری ملاقات ملیشیا کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان سے ہوئی۔ ان کا نام ڈاکٹر چندر مظفر (پیدائش ۱۹۴۷) ہے۔ وہ سیلنگور میں رہتے ہیں (Tel. 603-62019170)

ان کو بچپن میں پولیو ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ مستقل طور پر دونوں پیروں سے معذور ہو گئے۔ اب وہ وہیل چیئر پر رہتے ہیں۔ اس معذوری کے باوجود انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انگریزی زبان میں وہ لکھنے اور بولنے کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اپنی معذوری کے باوجود وہ ایک بھرپور زندگی گذارتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے لیے ایسا کیوں کر ممکن ہوا۔ انہوں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرا خدا پر عقیدہ تھا جس نے مجھے اپنی جسمانی معذوری پر قابو پانے کے لائق بنایا:

I would like to think that it is my faith in God, which enabled me to overcome my physical handicap.

خدا پر عقیدہ انسان کو باحوصلہ بناتا ہے۔ جب بھی اس پر کوئی مشکل پیش آتی ہے تو اس کا یہ یقین اس کے لیے سہارا بن جاتا ہے کہ میں نے جس ہستی کو اپنا خدا بنایا ہے وہ ہر چیز سے اوپر ہے۔ وہ تمام طاقتوں سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اس طرح خدا کا عقیدہ اس کو ہر بار نیا عزم دیتا ہے۔ وہ نئے حوصلہ کے ساتھ زندگی کی جدوجہد میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار وہ خدا کی توفیق سے کامیاب ہو جاتا ہے۔

انسان کے اندر فطری طور پر اتنے زیادہ امکانات رکھے گئے ہیں جو حادثات سے کبھی ختم نہ ہوں۔ ہر حادثہ کے بعد انسان کے لئے ایک نیا موقع باقی رہتا ہے۔ ہر حادثہ کے بعد یہ ممکن رہتا ہے کہ آدمی بقیہ امکانات کو استعمال کر کے از سرِ نو اپنی زندگی کی تعمیر کر سکے۔ ایک شاخ ٹوٹنے کے بعد وہ دوسری شاخ پر اپنا آشیانہ بنالے۔
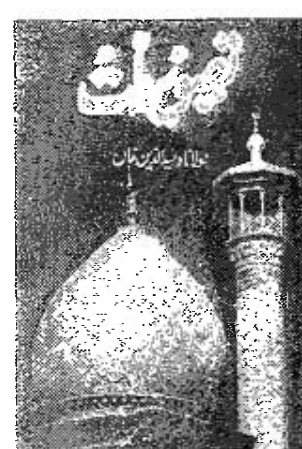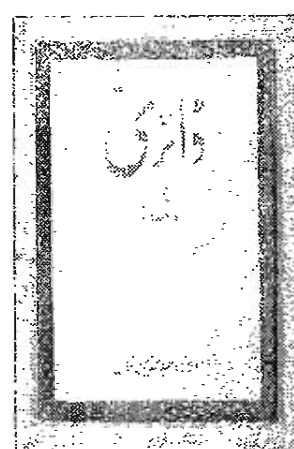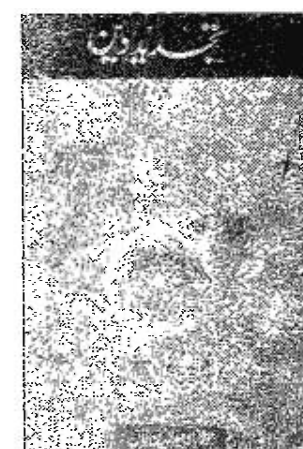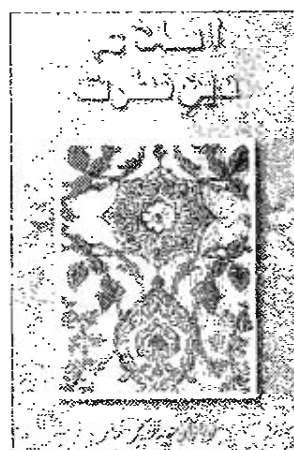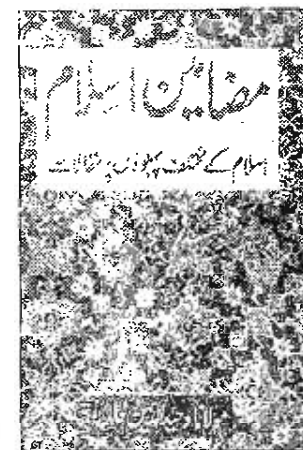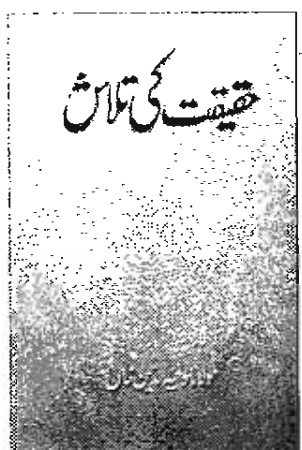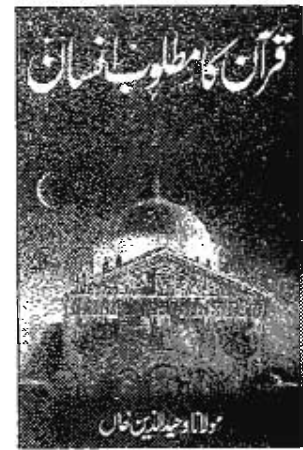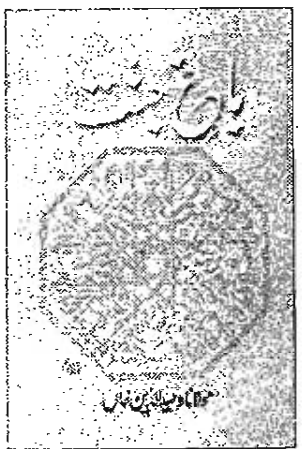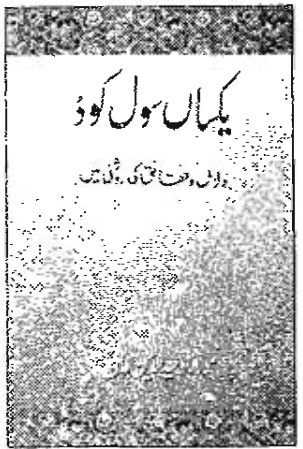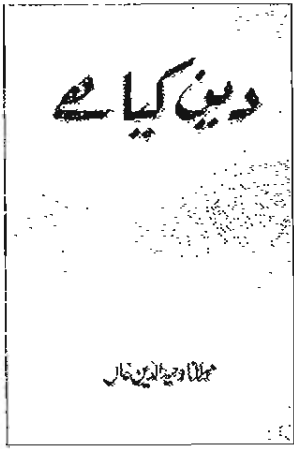
عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)
مطالعہ سیرت
اسباق تاریخ
تعمیر حیات
تعمیر انسانیت
سفر نامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
سفر نامہ غیر ملکی اسفار، جلد دوم
اسلام: ایک تعارف
اللہ اکبر
پیغمبر انقلاب
مذہب اور جدید چیلنج
عظمت قرآن
عظمت اسلام
عظمت صحابہ
دین کامل
الاسلام
ظہور اسلام
اسلامی زندگی
احیاء اسلام
راز حیات
صراطِ مستقیم
خاتونِ اسلام
سوشلزم اور اسلام
اسلام اور عصر حاضر
الربانیۃ
کاروانِ ملت
حقیقت حج
اسلامی تعلیمات
اسلام دور جدید کا خالق
حدیث رسول
راہ عمل
تعبیر کی غلطی
دین کی سیاسی تعبیر
عظمتِ مومن

اسلام: ایک عظیم جدوجہد
تاریخ دعوت حق
مطالعہ سیرت (کتابچہ)
ڈائری (جلد اول)
کتاب زندگی
اقوالِ حکمت
تعمیر کی طرف
تبلیغی تحریک
تجدید دین
عقلیاتِ اسلام
قرآن کا مطلوب انسان
دین کیا ہے؟
اسلام دین فطرت
تعمیر ملت
تاریخ کا سبق
فسادات کا مسئلہ
انسان اپنے آپ کو پہچان
تعارف اسلام
اسلام پندرہویں صدی میں
راہیں بند نہیں
ایمانی طاقت
اتحاد ملت
سبق آموز واقعات
زلزلہ قیامت
حقیقت کی تلاش
پیغمبر اسلام
آخری سفر
اسلامی دعوت
حل یہاں ہے
امہات المومنین
تصویر ملت
دعوت اسلام
دعوت حق
نشری تقریریں

دین انسانیت
فکر اسلامی
شتم رسول کا مسئلہ
طلاق اسلام میں
مضامین اسلام
حیات طیبہ
باغ جنت
نار جہنم
سچا راستہ
دینی تعلیم
خلیج ڈائری
رہنمائے حیات
تعدد ازواج
ہندستانی مسلمان
روشن مستقبل
صوم رمضان
اسلام کا تعارف
علما اور دور جدید
سفر نامہ اسپین و فلسطین
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
یکساں سول کوڈ
اسلام کیا ہے؟
میوات کا سفر
قیادت نامہ
منزل کی طرف
اسفار ہند
ڈائری ۹۰-۱۹۸۹
قال اللہ و قال الرسول
ڈائری ۹۲-۱۹۹۱
مطالعہ قرآن
مذہب اور سائنس